فہرست

مدرسہ علمیہ امام محمد باقر (ع) کا ترجمان: مجلۂ نوائے علم	اداریہ	03
روایتی قمہ زنی نقلی ہے، یہ ان کاموں میں سے ہے۔۔۔	آیۃ اللہ العظمیٰ سیّد علی خامنہ ای	08
اہل بیتؑ کے حقوق اہل سنّت کی تفسیروں میں	محمد یعقوب بشوی	18
دعاء امام زین العابدینؑ کا دین کی روشنی پھیلانے کا ہتھیار	مولانا سیّد مختار حسین جعفری	31
امام حسین علیہ السلام کا نامِ مبارک آسمانی کتابوں میں		36
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب، سوالات کے کٹہرے میں	استاد حسن الحسن	38
اتحاد کی حفاظت کے لیے حضرت علیؑ کے سب سے واضح اشارات	مولانا سیّد مختار حسین جعفری	41
رہبر انقلاب کی روایت، حضرت زینب اور حضرت آسیہ میں فرق	مولانا سیّد مختار حسین جعفری	44
تبرا کرنے کا مطلب لعنت بھیجنا نہیں ہے	حسن الحسن	48
دس شعبان امام زمانہ (عج) کی آخری توقیع۔۔۔		52
شیعہ فقہ کی تاریخ پر ایک نظر	مولانا سیّد مختار حسین جعفری	56
ظہور کی حتمی علامتوں کے نمونہ اور اسمبنل ہونے کے فریضے	مولانا سیّد مختار حسین جعفری	63

اداریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدرسہ علمیہ امام محمد باقر (ع) کا ترجمان : مجلہ نوائے علم

بسمہ تعالی

وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ (سورہ توبہ/ ۱۲۲)

ترجمہ: مناسب نہیں ہے کہ سارے مومنین اپنے گھروں سے نکل پڑیں، پس کیوں ہر فرقے میں سے کچھ لوگ اپنے گھروں سے کوچ نہیں کرتے تا کہ وہ علم فقہ حاصل کریں اور لوٹ کر آنے کے بعد اپنی قوم اور بستی کے لوگوں کو ڈرائیں تا کہ وہ خدا کے حکم کی مخالفت سے بچیں،

اس آیۂ کریمہ میں خداوند قدوس نے مطالبہ کیا ہے کہ کچھ لوگ علم دین کے حصول کے لیے اپنے گھروں سے نکلیں اور علمی مراکز میں جا کر علم حاصل کریں اور پھر اپنی بستیوں میں لوٹ کر آئیں تا کہ قوم اور بستی کی ہر دینی، مذہبی، ثقافتی اور تبلیغی ضرورت کو پورا کر سکیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو دینی تعلیم کے حصول کے لیے نکلنا چاہیے، کوئی بھی سماج اس وقت تک خود کفیل نہیں ہوسکتا جب تک اس میں مختلف دنیاوی اور گھریلو ضرورتوں کے امور کو انجام دینے والے افراد موجود نہ ہوں اسی طرح اگر کسی معاشرے میں علماء موجود نہ ہوں تو وہ معاشرہ بھی خود کفیل نہیں ہوسکتا، لہذا معاشرے میں علماء کا ہونا ضروری ہے، اور جس طرح معاشرے کے دیگر افراد کی ضرورتیں پوری کرنا اس معاشرے کی ذمہ داری ہے اسی طرح علماء کی ضرورتیں پوری کرنا ایک مسلمان اور مومن معاشرے پر لازم اور واجب ہے۔

جس طرح دنیاوی تعلیم کے حصول کے لیے اداروں کا ہونا ضروری ہے اسی طرح دینی تعلیم کے حصول کے لیے بھی مختلف سطوح کے اداروں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دنیاوی تعلیم کے مختلف سطح کے لاتعداد ادارے موجود ہونے کے باوجود کسی بھی ادارے میں بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کرنے والے موجود ہیں، جب کہ پورے پراونس جموں میں دینی تعلیم کا صرف ایک ادارہ ہے مگر اس میں بھی جتنے طلاب ہونا چاہیں اتنے موجود نہیں ہیں؟؟؟

دینی تعلیم دنیا اور آخرت دونوں کے لیے ہے جب کہ دنیاوی تعلیم کا فائدہ صرف دنیا میں ہے تو کیا وجہ ہے کہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں؟

اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ دینی تعلیم کے حصول کے بعد روزی روٹی کی کوئی ضمانت نہیں ہے اور اس سے آدمی کو روزگار نہیں ملتا تو آج کے زمانے میں دنیاوی تعلیم کے حصول کے بعد بھی روزگار کی کوئی ضمانت نہیں ہے اور اس چیز سے سبھی واقف ہیں پھر کیوں لوگ دنیاوی تعلیم کے لیے ہر حد سے گذر جاتے ہیں جب کہ دینی تعلیم کے حصول کے لیے ہلکی سی تکلیف بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ؟

موجودہ زمانے کی سچائی یہ ہے کہ بالغ ہونے کے بعد اگر پانچ سال تک منظم طریقے سے دینی تعلیم حاصل کی جائے تو انسان دین کی خدمت کرنے کے ساتھ کمانے کے قابل بھی ہو جاتا ہے جب کہ دینی تعلیم پر اس کا زیادہ سرمایہ بھی نہیں لگتا، لیکن دنیاوی تعلیم کے حصول میں قدم رکھنے کے بعد انسان تیس سال کی عمر میں بھاری سرمایہ لگانے اور تگ و دو کرنے کے بعد پی۔ایچ۔ڈی مکمل کرتا ہے مگر اس کے بعد بھی نوکری کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔اس کی مثالیں ہمارے اس معاشرے میں آپ کے سامنے موجود ہیں۔

پہلے دینی تعلیم کے حصول کا علاقے میں کوئی انتظام نہیں تھا جس کی بنا پر قوم کے کئی ہونہار فرزندوں نے دور دراز کا سفر طے کر کے قوم کی گردن سے واجب کفائی کا بوجھ ہلکا کیا۔اب خدا کا شکر ہے کہ وہ سعادت اور خوش بختی جو بعض بستیوں کے لوگوں کو سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میل کا سفر کرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے وہ آپ سے زیادہ دور نہیں ہے اور اس نعمت غیر مترقبہ پر ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

اور شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دامے درہمے سخنے اور قدمے اپنے علاقے میں قائم شدہ رب کریم کی بے پایاں عطا یعنی مدرسہء علمیہ امام محمد باقر علیہ السلام کی قدر کرنا چاہیے۔

جس بستی میں دینی مدرسہ ہو اس کے رہنے والوں کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ وہ قرآن و اہلبیت علیھم السلام کے نور کے حصار میں ہیں۔ بلا مبالغہ اس بستی کے رہنے والے اور اس کے قرب و جوار کے مومنین کرام اگر مکہ و مدینہ اور عتبات آئمہء معصومین (ع) اور بیت امام زمانہ (عج) کی خدمت کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے علاقے کے اس دینی تعلیمی مرکز کی خدمت کریں۔

خدمت کا طریقہ مالی امداد اور دیگر وسائل سے تعاون کرنے کے ساتھ ساتھ اس دینی مرکز کے وجود سے استفادہ کرنا ہے جو قدر دانی اور خدمت کا سب سے نمایاں اور حقیقی طریقہ ہے۔

مدرسے میں کارشناسی کرنے والے کو بی۔اے کی ڈگری ملتی ہے، اور کارشناسی میں داخلہ ملنے کے لیے طالب علم کا بارہویں پاس ہونا ضروری ہے،

مدرسہء علمیہ امام محمد باقر علیہ السلام میں داخلے

آپ کا مدرسہ ایک بار پھر آپ کے بچوں کو تعلیم و تربیت کے آب زلال سے سیراب کرنے کے لیے تیار ہے، یہ مدرسہ ایک ایسا جامع ادارہ ہے جس میں دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم دی جاتی ہے، اس مدرسے سے پڑھے ہوئے بچے دینی اور دنیاوی دونوں میدانوں میں خدا کے فضل و کرم اور آئمہء معصومین (ع) کی نظر عنایت سے نام کمانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور دینی اور ثقافتی دونوں میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔

مدرسے سے فارسی سیکھ کر یونیورسٹی میں داخلہ لینے والے سات طالب علم ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے سونے کے تمغوں سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ اس نمایاں کارکردگی کا سہرا صرف مدرسے کو جاتا ہے۔

مدرسہء علمیہ امام محمد باقر علیہ السلام ابتداء سے ہی المصطفیٰ عالمی یونیورسٹی کے تحت کام کر رہا ہے جس کے کئی طالب علم حوزہء علمیہ قم میں دینی میدان میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر رہے ہیں۔ یہ اس مدرسے کا اس دور دراز علاقے میں ایک بہت بڑا امتیاز ہے، یہ بچے علوم آل محمدؐ سے بھی آراستہ ہیں اور ان کے پاس ڈاکٹریٹ کی سند بھی ہے جس کی دنیاوی یونیورسٹیوں میں اتنی ہی حیثیت ہے جتنی ان کی اپنی ڈگریوں کی ہے۔ ہمارا مقصد روئے زمین پر خدا کی آخری حجت امام زمانہ (عج) کے ظہور کا راستہ ہموار کرنا ہے، اور یہ کام کسی ایک انسان کا نہیں ہے، اور نہ ہی معاشرے میں کچھ افراد کا بلکہ اس کے لیے پورے معاشرے کو تیار ہونا ہے، اور اس تیاری کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز علم اور معرفت ہے جو تقوے اور پرہیزگاری کا پیش خیمہ ہے، حجت خدا کے استقبال کے لیے علم اور معرفت سے سرشار تقوی اور پرہیزگاری ہر فرد کے لیے ضروری ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے مومنین کرام کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے نوجوان بچوں کو دینی تعلیم کے حصول کے لیے مدرسے میں داخل کروائیں اور ہر گھر میں علم کی روشنی پھیلائیں۔

مدرسے میں داخلے کے شرائط:

خدا کے فضل و کرم سے مدرسہء علمیہ امام محمد باقرع میں دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم کا انتظام ہے، لہذا مدرسے میں پرائمری اور مڈل کلاسز سے لے کر ہائر سیکینڈری تک کے بچوں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ پرائمری اور مڈل کلاسز کے بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم، جیسے نماز روزے اور دیگر احکام شرعیہ کی تعلیم کے ساتھ فارسی، عربی، اردو، انگریزی، قرائت و تجوید قرآن، ترتیل، تحسین، وغیرہ اور تمہیدیہ کی دیگر کتابوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ہائر سیکنڈری والے بچوں کے لیے، کاردانی اور کارشناسی کے باقیماندہ تین تین سال کے کورسز ہیں، کارشناسی کے بعد آزمون (اینٹرینس) ہوتا ہے، اور پاس ہونے والوں کو کارشناسی ارشد کے لیے ایران بھیجا جاتا ہے، پس مدرسے میں بارہویں تک کے ہر سن وسال کے بچوں کو درج ذیل شرائط کے تحت داخلہ دیا جاتا ہے۔

۱۔ امیدوار کو مدرسہ کا داخلہ فارم بھرنا ہوگا،
۲۔ امیدوار کو عہد کرنا ہوگا کہ وہ تعلیم کو بیچ میں نہیں چھوڑے گا،
۳۔ امیدوار ذہنی اور جسمانی اعتبار سے سالم ہونا چاہیے،
۴۔ امیدوار کو اکیڈمی کی فیس بھرنا پڑے گی،
۵۔ امیدوار کو انٹرویو میں حصہ لینا پڑے گا،
۶۔ امیدوار کو مدرسے کے قواعد وضوابط کی پابندی کرنے کا عہد کرنا ہوگا،
۷۔ امیدوار کو تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دین کی خدمت کرنے کا عہد کرنا ہوگا،

حفظ قرآن:

شیعوں پر عام طور سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ قرآن حفظ نہیں کرتے، علاقے کی سطح پر اس الزام کو دھونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں سے قرآن حفظ کروائیں، لہذا مدرسے نے پروگرام بنایا ہے کہ پرائمری اور مڈل کلاسز کے بچوں سے قرآن حفظ کروایا جائے گا۔ قوم سے اپیل کی جاتی ہے کہ اپنے ذہین ترین بچوں کو حفظ قرآن جیسے مقدس فریضے کی انجام دہی کے لیے وقف کریں تاکہ معاشرے کے اس خلاء کو پر کیا جا سکے۔

- قرآن حفظ کرنے والے بچوں کو مدرسے کی طرف سے ہر ممکن سہولت فراہم کی جائے گی،
- قرآن حفظ کرنے والے بچوں کو خصوصی شہریہ دیا جائے گا،
- حفظ قرآن کی مدت کم سے کم دو سال اور زیادہ سے زیادہ چار سال ہوگی،
- حفظ قرآن کی مدت میں بچے اپنی دنیاوی تعلیم جاری رکھ سکیں گے،
- حفظ قرآن کی کلاس میں داخلے کے لیے ٹیسٹ پاس کرنا ہوگا،
- قرآن حفظ کروانے کے لیے قم المقدسہ (ایران) سے فارغ التحصیل استاد کی خدمات لی جائیں گی

اہل ایمان حضرات وخواتین سے اپیل کی جاتی ہے کہ دین اور قوم وملت کی خدمت کے لیے آگے آئیں

اوراپنے ہونہارترین بچوں کواس کام کے لیے وقف کریں،اورامام زمانہ علیہ السلام کے سپاہی پیدا کر کے ان کی اورخدا کی خوشنودی حاصل کریں،

مدرسہ آپ کے بچوں کے تابناک مستقبل کا ذمہ دار ہے اپنے بچوں کو مدرسے میں داخل کروائیں اوران کے مستقبل کے بارے میں بےفکرہوجائیں۔

مزیدمعلومات حاصل کرنے کے لیےان موبایل نمبروں پررابطہ کریں:

۹۶۲۲۳۲۱۸۲۸۔۔۷۲۹۸۳۰۱۵۱۴۔۔،،۹۷۹۷۵۹۹۹۵۹

ہمارا ایمیل یہ ہے: mukhtarjafri72@gmail.com

مدرسہ کی امداد کرنے کے طریقے،

۱۔ آپ کے گھرمیں لگی ہوئی صندوقڑی میں صدقہ نیاز،نذراورامام ضامن وغیرہ ڈالیں،

۲۔ خمس وزکات اوردیگر رقوم شرعیہ دے کرمدرسے سے رسید حاصل کریں،

۳۔ مدرسے کوعطیہ دے کراپنی آخرت کے لیے ذخیرہ کریں،

۴۔ مرحومین کےایصال ثواب کے لیے مدرسے کونقدی امداددیں،

۵۔ اپنے بچوں کا عقیقہ مدرسے میں کروائیں۔

۶۔ مدرسہ علمیہ امام محمد باقرعؑ نے جموں کشمیر بینک کےتعاون سے ایک فارم نکالا ہےجس پرآپ اپنا نام،اکاونٹ نمبر،اورجتنی امدادآپ ہرمہینے مدرسے کودینا چاہتے ہیں وہ لکھ کردستخط کریں اور بینک میں جمع کروادیں ، وہ رقم ہر مہینے آپ کے اکاونٹ سے مدرسے کے اکاونٹ میں منتقل ہوجائے گی ، مدرسے کی امداد کرنے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔

مدرسہ سب کا ہے،سب کے لیے ہے،اورسب کو مدرسے کے لیے کام کرنا چاہیے،مدرسے سے لگاؤ رکھنا چاہیےاور مدرسے کی ترقی میں ہاتھ بٹانا چاہیے،یہ ادارہ قوم کا تشخص ہے،قوم کی پہچان ہے،قوم کے وقار کی علامت ہے،اس کے بارے میں یہ سوچنا کہ یہ کسی خاص گروہ کا ہے گناہ ہے،قوم کے ہرچھوٹے بڑے کوسر اونچا کر کے یہ کہنا چاہیے کہ یہ مدرسہ ہمارا ہے۔دنیا میں جہاں بھی کوئی مدرسہ ہے وہ امام زمانہؑ کا گھر ہے،امام زمانہ کا تبلیغی مرکز ہےاب یہ ہمیں سوچنا ہے کہ ہمیں اپنے امامؑ کے گھرکوکس طرح آبادرکھنا ہے؟

و آخر دعوانا الحمدللہ رب العالمین۔

روایتی قمہ زنی نقلی ہے، یہ ان کاموں میں سے ہے جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں

رہبر معظم: آیۃ اللہ العظمیٰ سیّد علی خامنہ ای

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمدللہ رب العالمین.
والصلاۃ والسلام علی سیدنا محمد وآلہ الطاھرین۔

محرم کے حوالے سے دو باتیں ہیں ایک عاشورہ کی تحریک کے بارے میں، اگرچہ امام حسین علیہ السلام کے قیام کے فلسفے کے بارے میں بہت زیادہ کہا اور لکھا جاتا ہے نہایت عمدہ باتیں اس سلسلے میں بیان ہوتی رہتی ہیں۔لیکن حقیقت میں عمر بھر اس کی درخشاں حقیقت کو بیان کیا جاسکتا ہے۔جتنا بھی عاشورہ اور امام حسین علیہ السلام کے قیام کے بارے میں غور کریں تو معلوم پڑھنا ہے کہ یہ معاملہ کئ اعتبار سے پرکشش اور کئ اعتبار سے تفکر کرنے اور بیان کرنے کے قابل ہے۔

محرم کے حوالے سے دوسری بات جو بحث کرنے کے قابل ہے اور اس بارے میں کم ہی گفتگو کی جاتی ہے وہ حسین بن علی علیہ السلام کی عزاداری، اور عاشورہ کو زندہ رکھنے کی برکتیں ہیں۔حقیقت میں اسلامی معاشرے میں شیعوں کا سب بڑا امتیاز اپنے دوسرے مسلمانوں پر یہ ہے کہ شیعہ معاشرے کے پاس عاشورہ کی یاد ہے۔ جس دن سے حسین بن علی علیہ السلام کی مصیبت بیان کرنا ایک باب بن گیا، اھل بیت علیہم السلام کے چاہنے والوں اور ماننے والوں کے ذہنوں سے معنویت اور فیض کے چشموں نے پھوٹنا شروع کیا، یہ چشمے ابھی تک جاری اور ساری ہیں اور آج کے بعد بھی جاری رہیں گے۔جس کا راز عاشورہ کی یاد ہے، عاشورہ کو بیان کرنا صرف ایک واقعہ کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسے حادثے کو بیان کرنا ہے کہ جس کی طرف ابتداء میں بھی اشارہ کیا گیا کہ اس کے بے شمار اعتبارات ہیں۔اسلئے یہ یاد حقیقت میں ایک ایسا عمل ہے جو کہ بے شمار برکات پر محیط ہوسکتا ہے۔

آپ توجہ فرمائیں کہ ائمہ علیہم السلام کے زمانے میں رونا اور رلانا اپنی جگہ ایک مقام رکھتا ہے۔کوئی خیال نہ کرے کہ فکر، استدلال اور منطق کے سامنے رونے کا کیا کام۔اور یہ تو پرانی بات ہے! نہیں! ایسا سوچنا غلط ہے۔جذبات کا اپنا مقام ہے۔اور منطق و استدلال کا اپنا مقام ہے، ہر ایک کا، انسان کی شخصیت میں اپنا

کردار ہے۔ بہت سارے مسائل ایسے ہیں جو کہ محبت اور جذبات کے ساتھ حل کئے جا سکتے ہیں اور ان میں منطق اور استدلال کا عمل دخل نہیں ہے۔ اگر آپ انبیاء کی تحریکوں کو دیکھیں، تو آپ ملاحظہ کریں گے کہ جب پیغمبر مبعوث ہوتے تھے، پہلے جو اُن کے اردگرد جمع ہوتے تھے اس کا عامل منطق اور استدلال نہیں ہوتا۔ پہلا مرحلہ جذباتی اور احساساتی ہے، البتہ ہر سچے جذبے کے پیچھے ایک فلسفی برھان موجود ہوتا ہے۔

مگر بحث اس بات پر ہے کہ جب نبی اپنی دعوت شروع کرتا ہے وہ اپنا فلسفی استدلال بیان نہیں کرتا۔ بلکہ سچا احساس اور جذبہ بیان کرتا ہے۔ پہلے معاشرے میں جو ظلم جاری ہے، جو طبقاتی اختلاف موجود ہے لوگوں پر ''انداداللہ'' انسانوں اور انسان نما شیطانوں کی طرف جو دباو ہے اسکی طرف معطوف کرتا ہے۔ یہ وہی جذبات اور احساسات ہیں، البتہ جب تحریک اپنی معقول اور عادی سطح پر پہنچ جاتی ہے تو استدلال اور منطق کی نوبت آجاتی ہے۔

عاشورہ کا حادثہ، ذاتی طور ایک سچے جذبے کا ٹھاٹیں مارتا سمندر ہے۔ ایک عظیم انسان، جسکی نورانی، پاکیزہ اور ملکوتی شخصیت ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، جن کے مقصد کے بارے میں منصفین عالم کا اتفاق ہے کہ وہ معاشرے کو ظلم و جور سے نجات دلانے کیلئے ہے، تعجب برانگیز حرکت شروع کر دیتے ہیں، اپنی حرکت کا فلسفہ جور کا مقابلہ قرار دیتے ہیں، بحث مقدس ترین مقصد کے بارے میں ہے جو کہ منصفین عالم بھی قبول کرتے ہیں۔ اس قسم کی شخصیت ایسے مقصد کیلئے مشکل ترین جنگ برداشت کرتا ہے۔

مشکل ترین جنگ غریبی کی جنگ ہے، عام و خاص کی داد تحسین اور ھیاھو کی فضا میں جنگ لڑنا مشکل نہیں ہے، جس طرح صدر اسلام میں حق و باطل کے سپاہیوں کی صفیں ایک دوسری کے مقابلے میں کھڑی ہیں اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے سپاہیوں سے پوچھا: کون تیار ہے میدان میں نکل کر دشمن کا فلاں معروف جنگجو کا خاتمہ کرلے، لشکر اسلام کا ایک جوان رضا کارانہ طور سامنے آتا ہے۔ پیغمبرؐ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے وداع کیا، مسلمانوں نے بھی اس کے حق میں دعا کی اور وہ میدان جنگ کی طرف روانہ ہوکر جہاد کرتے کرتے مارا گیا۔ یہ بھی ایک قسم کا مرنا ہے اور جہاد ہے۔

دوسری قسم کی جہاد وہ جہاد ہے جس میں جب انسان میدان میں جاتا ہے، لوگ یا اسے جانتے نہیں، یا اس کے مخالف ہیں، یا اس سے آنکھیں چراتے ہیں، یا اس کے مقابلے میں آتے ہیں۔ جو کوئی دلی طور انہیں داد تحسین دیتے ہیں ان کی تعداد کم ہے۔ ان میں جرأت نہیں ہے کہ زبانی داد تحسین دے سکیں، حتیٰ عبداللہ بن عباس، اور عبداللہ بن جعفر جیسے افراد جو کہ خود بھی اسی شجرہ طیبہ اور خاندان بنی ہاشم سے ہیں، جرأت نہیں کرتے مکہ یا مدینہ میں بیٹھ کر فریاد بلند کرکے امام حسین علیہ السلام کے نسبت اپنی حمایت ظاہر کریں۔ ایسی جنگ غریبی

کی جنگ ہے اور غریبی کی جنگ مشکل ترین جنگ ہے۔

سب انسان کے دشمن، سبھی انسان کے مخالف، امام حسین علیہ السلام کی جنگ میں حتیٰ کچھ دوست بھی مخالف، کہ ان میں سے کسی ایک سے جب فرمایا: آؤ میری مدد کرو، اور اس نے اپنے بدلے میں اپنے گھوڑے کو حضرت کیلئے بھیجا اور کہا کہ میرے گھوڑے کو استعمال میں لائیں، کیا اس سے بھی بڑ کر غریبی ہے، اس سے بھی بڑ کر غربت کی جنگ ہے!

اس غریبی کی جنگ میں اپنے سب سے عزیز آنکھوں کے سامنے مارے جائیں، اسکے اپنے اولاد، بھائی، بھتیجے، چچیرے بھائی، بنی ھاشم کے یہ پھول انکی آنکھوں کے سامنے مسل کر رکھ دیئے جائے، حتیٰ چھے مہینے کا بچہ مارا جائے، ان تمام مصیبتوں سے بڑ کر یہ معلوم ہونا کہ جب ان کے جسم مطہر سے جان خارج ہو جائے گی، ان کی بے دفاع اور بے پناہ اہل وعیال پر حملہ کیا جائے گا۔ جانتے ہیں کہ بھوکے بھیڑیئے ان کی چھوٹی، بڑی بیٹیوں پر حملہ کریں گے، ان کو ڈرا دھمکائیں گے، انکے مال واسباب کو لوٹ لیں گے، غارت کریں گے، انکی اہانت کریں گے۔ جانتے ہیں کہ امیر المومنین کی والا مقام بیٹی زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا جو کہ اسلام کی عظیم خاتون ہے ان کے ساتھ جسارت کی جائے گی۔ یہ سب جانتے ہیں اور اس پر اپنی، اپنے اہل وعیال کی تشنگی کے عالم کو بھی اضافہ کریں، چھوٹے چھوٹے بچے پیاسے، بچیاں پیاسی، بوڑھے پیاسے، حتیٰ کہ شیر خوار بچہ بھی پیاسا، کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ جنگ کتنی مشکل جنگ ہے۔

ایک ایسا عظیم انسان، پاک ومطہر کہ جس کو دیکھنے کیلئے آسمان کے ملائکہ ایک دوسرے پر سبقت لیتے ہیں اور حسین بن علیؑ کی زیارت کی تمنا کرتے ہیں تا کہ ان سے متبرک ہو سکیں، ایک ایسا انسان کہ جس کے مقام کی آرزو انبیاء واولیا کرتے ہیں ایسے جنگ میں ان شدید ترین حالات میں شہادت پاتے ہیں، ایسی شخصیت کی شہادت، عظیم حادثہ ہے۔

کس انسان کا جذبہ اس حادثے سے جریحدار نہیں ہو سکتا! اس حادثے کو جاننے اور سمجھنے کے بعد کون اسکا عاشق نہیں بن سکتا؟ کبھی کوئی کسی نعمت سے محروم ہے اس سے اس نعمت کے بارے میں سوال بھی نہیں ہوگا۔ لیکن جب کوئی کسی نعمت سے بہرہ مند ہے اس سے اسکے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت حسین بن علی علیہ السلام کی یاد ہے، یعنی مجالس عزاداری کی نعمت، محرم کی نعمت، عاشورہ کی نعمت، ہمارے شیعہ معاشرے کے لئے ہے، افسوس کہ مسلمانوں میں غیر شیعہ بھائیوں نے اپنے آپ کو اس نعمت سے محروم رکھا ہے، جبکہ وہ بھی اس نعمت سے خود کو بہرہ مند کر سکتے ہیں اور امکانات بھی موجود ہیں۔

اب جبکہ محرم اور عاشورہ اور امام حسین علیہ السلام کی یاد ہمارے درمیاں رائج ہے اس یاد اور ان مجالس

سے ہم کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور اس نعمت کا شکرانہ کیا ہے؟ اسی موضوع میں پر گفتگو کرنا میرا مقصد ہے۔ یہ عظیم نعمت دلوں کو اسلامی ایمان کے منبع سے جوڑتی ہے۔ ایسا کام کرتی ہے جو کہ پوری تاریخ میں انجام دیا، ستمگر حاکم عاشورہ سے ڈرتے ہیں، اور امام حسین علیہ السلام کی نورانی قبر سے خائف تھے۔ واقعہ عاشورہ اور اس کے شہداء سے ڈرنے کا سلسلہ خلفاء بنی امیہ سے شروع ہوا اور ہمارے زمانے تک جاری ہے اور آپ لوگوں {ایرانی عوام کی طرف اشارہ} نے اپنے انقلاب کے دوران خود اس کا نمونہ مشاہدہ کیا، اس منحوس (پہلوی) حکومت کی موجود گزارشوں میں سے اشارات بلکہ واضح طور ملتا ہے کہ محرم کے آنے کے ساتھ ان کے ہوش اڑ جاتے تھے۔ یہ محرم، مجالس عزاداری اور امام حسین علیہ السلام کی یاد کی نعمتوں کا ایک نمونہ ہے جو آپنے دیکھا۔ اس لئے علماء اور عوام کو ان نعمات سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

عزاداری سے متعلق عوام کی ذمہ داریاں

عوام کا فائدہ اٹھانا؛ یہ ہوا کہ سید الشہدا علیہ السلام کی عزاداری کی مجالس کے ساتھ لو لگائیں اور ان کا انعقاد ہر سطح پر زیادہ سے زیادہ کیا کریں۔ لوگ خلوص کے ساتھ مجالس عزاداری سے بہرہ مند ہونے کی غرض سے شرکت کیا کریں، نہ کہ وقت بتانے کیلئے یا عامیانہ طریقے سے صرف ثواب اخروی حاصل کرنے کی غرض سے، بطور مسلم ان مجالس میں شرکت کرنے سے اخروی ثواب حاصل ہوتے ہیں، لیکن مجالس کیلئے کیوں ثواب ہیں، کس وجہ سے ہیں؟ یقینا کسی وجہ سے ہیں، اگر وہ وجہ اس میں نہ ہو ثواب بھی نہیں ہوگا۔ کچھ لوگ اس نقطے کی طرف دھیان نہیں دیتے۔

سبھوں کو ان مجالس میں شرکت کرنی چاہئے، ان مجالس کی قدر و منزلت جاننی چاہئے، ان مجالس سے فائدہ اٹھائیں اور دل و جان سے ان مجالس کو اپنے اور حسین بن علی علیہ السلام، پیغمبر کے خاندان، اسلام اور قرآن کے روح کے ساتھ جوڑنے کا وسیلہ بنائیں۔ یہ ذمہ داری عوام کیلئے مخصوص ہے۔

عزاداری سے متعلق علماء کی ذمہ داریاں:

اور اب علماء کی ذمہ داری کے بارے میں؛ یہ مسئلہ سخت تر ہے، چونکہ مجلس عزا کی روح یہ ہے کہ لوگ جمع ہو جائیں اور ایک عالم دین ان کے درمیان حاضر ہو کر مجلس عزا قائم کرے تا کہ باقی اس سے مستفید ہو جائیں۔ ایک عالم دین کو کس طرح مجلس عزا قائم کرنی چاہئے؟ میرا یہ سوال ان سبھوں سے ہے جو اس بارے میں احساس مسئولیت کرتے ہیں۔ میرے عقیدے کے مطابق مجلس حسینی کی تین 3 خوبیاں ہونی چاہئے۔

1۔ مجالس حسینی سے اھل بیت علیہم السلام کے نسبت دلی لگاؤ پیدا ہونا چاہئے۔ کیونکہ دلی لگاؤ ایک انمول

ذریعہ ہے۔آپ علماء دین کو چاہئے ایسا سلیقہ اختیار کریں کہ جس سے مجلس میں شرکت کرنے والوں میں حسین بن علی علیہ السلام اور خاندان پیغمبرؐ کے نسبت محبت بڑنے کے ساتھ ساتھ، معرفت الٰہی میں بھی اضافہ ہونا چاہئے۔اگر خدانا خواستہ آپ مذکورہ معنویت کے بجائے مجلس میں ایسی حالت پیدا کریں کہ سننے والا یا اس ماحول سے دور انسان دلی طور اھل بیت علیہم السلام کے نزدیک ہونے کے بجائے دوری اور بیزاری کا احساس کرے، ایسی مجلس نہ صرف اپنے سب سے بڑے فائدے سے محروم رہی بلکہ ایک اعتبار سے نقصان دہ ہے۔اب جبکہ آپ مجلس کے بانی یا مقرر ہیں، تدبر کریں کہ آپ ایسا کیا کچھ کر سکتے ہیں کہ جس سے لوگوں کے درمیان ان مجالس میں شرکت کرنے سے، حسین بن علی علیہم السلام اور اھل بیت پیغمبر علیہم افضل صلواۃ اللہ کے نسبت دن بہ دن معرفت ومحبت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو سکے۔

2۔ مجالس حسینی میں واقعہ عاشورہ کے بارے میں عوام کی معرفت زیادہ شفاف اور زیادہ روشن ہونی چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم حسین بن علی علیہ السلام کی مجلس میں جائیں، ممبر پر بیٹھ کر تقریر کریں لیکن اس مجلس کے لوگ اس فکر میں ڈوبے ہوں کہ "ہم تو اس مجلس میں آئے، شرکت کی، گریہ زاری بھی کیا آخر کس لئے؟ یہ کیا بات تھی؟ آخر امام حسین علیہ السلام کیلئے کیوں رونا ہے، آخر کیوں امام حسین علیہ السلام کربلا گئے اور عاشورہ کو وجود میں لایا؟" اسلئے ایک واعظ یا مقرر ہونے کی حیثیت سے آپ ایسے موضوعات کو زیر بحث لائیں کہ جن سے ایسے سوالات کیلئے جوابات حاصل ہوں۔واقعہ عاشورہ کے بنیادی عوامل واسباب کے بارے میں لوگوں میں معرفت پیدا کرنی ہوگی۔

3۔ ان مجالس کی تیسری، ضروری خاصیت، لوگوں میں ایمان اور دینی معرفت میں اضافہ ہے۔ان مجلسوں میں چاہئے دین سے ایسے نکات عنوان کئے جائیں جن سے مخاطب اور سننے والوں میں ایمان اور معرفت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو سکے۔یعنی واعظ اور خطیب ایک صحیح موعظہ، ایک صحیح حدیث، سبق آموز تاریخ کا کوئی حصہ، آیہ قرآن کی صحیح تفسیر یا کسی ایک اسلامی عالم اور عظیم مفکر کی باتیں اپنے بیانات میں شامل کرے اور سننے والوں اور اس مجلس میں شرکت کرنے والوں تک پہنچائے۔ایسا نہ ہو کہ جب ہم ممبر پر جائیں، تھوڑی بہت لفاظی کریں اور باتیں کریں اور اگر اس بیچ کوئی بات بھی کریں وہ ضعیف ہو، جس سے سننے والوں کے ایمان میں اضافہ ہونے کے برعکس سست اور کمزور ہو جائے۔اگر ایسا ہو تو ہم ان مجلسوں میں مذکورہ فوائد اور مقاصد کو نہیں پہنچے۔

غیر معتبر واقعات بیان کرنے سے پرہیز:

مجھے نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ کبھی کبار ایسا ہی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے، یعنی کبھی کوئی مجلس میں ایسی بات نقل کرتا ہے جو کہ عقلی اور نقلی استدلال کے اعتبار سے بھی سست ہیں اور سننے، سمجھنے، اور اھل منطق واستدلال کی ذھن کیلئے بھی تباہ کن ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کتاب میں کوئی بات لکھنے والے نے لکھی ہے اور اسکو جھٹلانے یا صحیح ثابت کرنے کیلئے دلیل بھی نہیں ہے، ممکن ہے کہ سچ ہو، ممکن ہے کہ جھوٹ ہو، اگر آپ یہ نقل کریں گے، گرچہ یہ مسلم نہیں ہے کہ خلاف واقع ہو، لیکن اس کے سننے سے، مستمعین میں پڑھے لکھے جوان یا رزمندہ یا انقلابی کے ذھن میں سوال اور مسئلہ پیدا ہو جائے۔ شک وشبہ پیدا ہو جائے، ان باتوں کو بیان نہیں کرنا چاہئے۔ اگرچہ اسکی سند بھی صحیح ہو؛ کیونکہ گمراہی اور انحراف کا سب بنتی ہے نقل نہیں کرنا چاہئے؛ جبکہ بعض کتابوں میں مندرج اکثر ایسی باتوں کی کوئی سند بھی نہیں ہے۔

کوئی کسی کی بات کو کہ میں جی، فلاں سفر میں فلاں جگہ پر تھا وہاں ایسا واقعہ رونما ہوا۔ کہنے والا کسی سند یا سند کے بغیر کہہ دیتا ہے، سننے والا اس پر یقین کرتا ہے اور کتاب میں اسکو تحریر کرتا ہے اور یہ کتاب میرے اور آپ تک پہنچ جاتی ہے۔ میں اور آپ کیوں اس بات کو جس کو ایک بڑے مجمع میں، ہوشیار اور بیدار اذھان کیلئے توجیہ نہیں کیا جا سکے بیان کریں! کیا جو کچھ بھی جہاں کہیں بھی لکھا جائے، انسان کو ضروری پڑھنا ہے اور دوسروں کیلئے بیان کرنا ہے۔

آج ملک بھر کے عام جوان۔ لڑکوں، لڑکیوں سے لے کر مرد اور خواتین، حتیٰ غیر جوانوں کے اذہان کھلے ہیں۔ اگر کل، انقلاب سے پہلے صرف جوان پڑھے لکھے طبقے میں یہ خوبی پائی جاتی تھی، لیکن آج صرف ان کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ آج سبھی، مسائل کو بصیرت اور استبصار کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں۔ آج ہمارے معاشرے کا مہم حصہ شک وشبہات میں گھیرا ہوا ہے، یعنی دشمن شکوک پیدا کرتا ہے۔ دشمن بھی نہیں، منکرین میری اور آپ کی ذہن میں شک وشبہات پیدا کرتے ہیں۔

مہم یہ ہے کہ آپ ایسے مطالب بیان کریں جن سے یہ شبہات دور ہو جائیں، نہ کہ ان شبہات میں اضافہ ہو جائے۔ کچھ لوگ اس مہم مسؤلیت کی طرف توجہ کئے بغیر ممبر پر چڑھ جاتے ہیں، اور ایسی باتیں کرتے ہیں کہ جس سے نہ صرف سننے والے کے ذہن سے، موجود الجھن دور ہوتی ہے بلکہ الجھنوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا کچھ ہوا، ہم نے ممبر پر ایسی بات کی کہ جس سے دس جوان، حتیٰ ایک جوان کے ذھن میں دین کے سلسلے میں کوئی الجھن پیدا ہو جائے اور بعد میں ہماری مجلس سے چلا جائے اور ہم بھی اسے نہیں جانتے ہوں، تو کس طرح اس کی اصلاح کی جائے؟ کیا اس کی تلافی ممکن ہے۔ بہت مشکل کام ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہر مجلس میں یہ تمام خوبیاں ہونی چاہئے اور ان تمام موضوعات پر بحث ہونی چاہئے ؛ نہیں ، آپ اگر ایک معتبر کتاب سے ایک صحیح حدیث نقل کریں اور اسکا ترجمہ کریں کافی ہے ۔ کچھ واعظ و خطیب حضرات ایک حدیث کی اتنی شاخیں نکالتے ہیں کہ اسکا اصلی معنی ہی گم ہوجاتا ہے۔

اگر آپ اپنے سننے والے کیلئے ایک حدیث کا صحیح معنی بیان کریں گے ممکن ہے کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں اسکا عمدہ حصہ اسی میں ہو۔ اگر مصائب بیان کرنے کیلئے مرحوم محدث قمی کی کتاب نفس المہموم کو کھول کر پڑھا جائے سننے والوں کیلئے گریہ آور ہے ۔ اور اس سے وہی جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے ۔ کیا ضرورت ہے کہ ہم کوئی ایسا کام کریں کہ جس سے عزاداری کی مجلس اپنے اصلی فلسفے سے دور رہ جائے ۔

خرافات اور خونی ماتم سے پرہیز:

حقیقت میں مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ خدانخواستہ اس دور میں جو کہ ظہور اسلام ، بروز اسلام ، تجلی اسلام اور تجلی فکر اھلبیت علیہم الصلاۃ والسلام ہے اپنے وظیفے کو انجام نہ دے سکیں ۔ کچھ کام ایسے ہیں کہ جس کے انجام دینے سے لوگ خدا اور دین کے نزدیک ہوتے ہیں ، ان کاموں میں سے ایک یہی روایتی عزاداری ہے جو کہ لوگوں کو دین کے ساتھ جڑے رکھنے کا سبب بنتا ہے ۔ یہ جو امام فرماتے تھے" روایتی عزاداری کیا کریں" اسی سے جڑنے کے لئے کہتے تھے ۔ عزاداری کی مجلسوں میں بیٹھنا ، مرثیہ پڑھنا ، رونا ، سر اور سینے کو پیٹنا ، عزاداری کے جلوس نکالنا ، یہ سب پیغمبرؐ کے خاندان کے نسبت لوگوں کی محبت میں حرارت پیدا کرتا ہے اور بہت ہی اچھا اور مستحسن کام ہے ۔ اس کے برعکس کچھ ایسے کام بھی ہیں کہ جنہیں انجام دینے سے کسی کو دین ہی سے بھگا دیتا ہے ۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پچھلے ان تین چار سالوں سے محرم میں عزاداری کے دوران کچھ غلط کام میں دیکھنے کو مل رہے ہیں کہ جنہیں غلط ہاتھوں کے ذریعے ہمارے معاشرے میں رائج کیا جاتا ہے ۔ ایسا کام انجام دیا جاتا ہے جو کہ دیکھنے والے کیلئے سوال برانگیز ہے ۔ مثال کے طور پر ، پرانے زمانے میں طبقہ عوام الناس میں معمول بن گیا تھا کہ عزاداری کے دنوں میں اپنے آپ کو تالا باندھتے تھے ! البتہ جب بزرگوں اور علماء نے ایسا کرنے سے منع کیا یہ غلط رسم ختم ہوگئ ۔ لیکن اب اس رسم کو دوبارہ ترویج کرنا شروع کیا گیا ہے اور میں نے سنا کہ ملک کے مختلف حصوں میں کچھ لوگ اپنے بدن پر تالا چڑھاتے ہیں ! یہ غلط کام ہے ۔ کیوں کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں !

قمہ زنی بھی ایسا ہی ہے ۔ قمہ زنی بھی خلاف کاموں میں سے ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ ضرور کہیں

گے کہ"فلاں کو قمہ زنی کا نام نہیں لینا چاہئے تھا"،ضرور کہیں گے کہ"آپکو قمہ زنی سے کیا مطلب تھا، کچھ لوگ کرتے ہیں کرنے دیجئے"۔نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا، ایسی غلط حرکت کے مقابلے میں خاموشی اختیار نہیں کی جاسکتی۔جس طرح ان چار، پانچ سالوں سے جس طرح قمہ زنی کو رائج کیا جاتا ہے اگر امام (خمینی) رضوان اللہ علیہ کی حیات مبارکہ میں ایسا ہوتا وہ قطعاً اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔

یہ غلط ہے کہ کچھ لوگ ہاتھوں میں قمہ لے کے سروں پر دے ماریں، اپنے آپ کو لہولہان کریں۔ایسا کرنے سے کیا ہوگا! یہ کیسی عزاداری ہے؟ جبکہ سر اور صورت پیٹنا ایک قسم کی عزاداری ہے۔آپ نے کئی بار خود مشاہدہ کیا ہوگا کہ جب کسی کو مصیبت پیش آتی ہے وہ سر اور صورت پیٹتا ہے۔یہ معمول کی عزاداری ہے۔مگر آپ نے کہاں دیکھا کہ کوئی اپنے عزیز ترین عزیز کیلئے تلوار کو ہاتھ میں لے کر اپنے دماغ اور سر پر مارتا ہے خون بہاتا ہے! کہاں ایسا کرنا عزاداری ہے! روایتی قمہ زنی نقلی ہے۔یہ ان کاموں میں سے ہے جنکا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس میں کوئی شک نہیں خدا بھی اس کام سے راضی نہیں ہے۔

علماء سلف کے ہاتھ بندھے تھے،نہیں کہہ سکتے تھے کہ" یہ کام غلط اور خلاف ہے"آج اسلام کی حاکمیت اور اسلام کے جلوہ کا دن ہے۔ایسا کوئی کام نہ کیا جائے کہ جس سے اسلامی معاشرے کا برترین طبقہ یعنی محب اھل بیت علیہم السلام کا معاشرہ جو کہ امام زمان ارواحنا فداہ کے نام مقدس، حسین بن علی علیہ السلام کے نام اور امیر المؤمنین علیہ الصلاۃ والسلام کے نام سے مفتخر ہیں، باقی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی نظروں میں ایک خرافاتی قسم کا معاشرہ متعارف کیا جائے۔

حقیقت میں، میں نے جتنا بھی اس قمہ زنی کے بارے میں جو کہ یقیناً ایک خلاف اور غلط کام ہے غور کیا، دیکھا کہ اپنے عزیز لوگوں کو بتانا ضروری ہے کہ ایسا نہ کریں۔یقیناً میں اس کام سے کسی بھی صورت میں راضی نہیں ہوں۔اگر کسی نے قمہ زنی کا مظاہرہ کیا، میں دلی طور سے اس سے ناراض ہوں۔یہ بات میں نہایت تاکید کے ساتھ عرض کرتا ہوں۔

ایک زمانہ تھا، اطراف واکناف میں کچھ لوگ جمع ہوتے تھے،عمومی نظروں سے پوشیدہ قمہ زنی کیا کرتے تھے اور ان کے کام کا مظاہرہ آج کل کا جیسا نہ تھا، کسی کو اسکے اچھا یا برا ہونے سے کوئی مطلب نہ تھا۔کیونکہ ایسا ایک محدود دائرے میں انجام پاتا تھا۔لیکن جب اچانک ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کا تہران کی یا قم یا آذربایجان یا خراسان کے جیسے شہروں میں سڑکوں پر ہاتھوں میں قمہ اور تلواریں لے کے سر وصورت پر مارتے ظاہر ہونا ہو۔قطعاً یہ غلط کام ہے۔امام حسین علیہ السلام اس طریقے سے راضی نہیں ہیں۔میں نہیں سمجھ پاتا کہ کون سا سلیقہ اور کہاں سے یہ عجیب بدعات اور خلاف کام اسلامی معاشرے اور انقلابی معاشرے میں لائے

جاتے ہیں!۔

پچھلے دنوں میں، زیارت کے سلسلے میں بھی ایک عجیب وغریب اور نامانوس بدعت کو کھڑا کیا گیا ہے! اس طرح کہ جب ائمہ معصومین علیہم السلام کی قبور کی زیارت کرنا چاہتے ہیں، صحن کے دروازے سے داخل ہوتے ہی اپنے آپ کو سینے کے بل گراتے ہیں اور سینہ خیز اپنے آپ کو حرم تک پہنچاتے ہیں! آپ جانتے ہیں کہ پیغمبر صلواۃ اللہ علیہ کی قبر مطہر اور قبور امام حسینؑ، امام صادقؑ، موسی بن جعفر، امام رضا اور باقی ائمہ علیہم السلام کی سبھی لوگ، علماء اور بڑے فقہا، مدینہ، عراق اور ایران میں زیارت کرتے تھے۔ کیا آپ نے کبھی بھی سنا کہ ائمہ علیہم السلام میں سے کسی ایک نے ایسا کیا ہو اور یا علماء جب زیارت کو جانا چاہتے تھے اپنے آپ کو صحن کے دروازے سے گراتے تھے اور سینہ خیز اپنے آپ کو حرم تک پہنچاتے تھے! اگر ایسا کرنا مستحسن اور مستحب ہوتا، مقبول اور صحیح ہوتا، ہمارے بزرگ ایسا کرتے، لیکن نہیں کیا۔ جبکہ نقل کیا گیا ہے کہ مرحوم آیت اللہ العظمیٰ آقای بروجردی رضوان اللہ تعالی علیہ، وہ بڑے عالم اور قوی، عمیق اور روشن فکر مجتہد، ضریح کو چومنے سے منع کرتے تھے جو کہ شاید مستحب ہے۔ احتمالاً ضریح چومنے کے بارے میں روایت بھی موجود ہیں۔ دعا کی کتابوں میں ہے۔ میرے ذہن میں بھی ہے کہ ضریح چومنے کے سلسلے میں روایت موجود ہے۔ اسکے باوجود کہ ضریح کو چومنا مستحب ہے انہوں نے کہا: "ایسا نہ کریں، مبادا دشمن خیال کرے کہ سجدہ کرتے ہیں اور شیعوں کے خلاف الزام تراشی کیلئے نیا بہانہ پائیں"۔

لیکن آج جب کچھ لوگ صحن مطہر علی بن موسی الرضا علیہ الصلاۃ والسلام میں داخل ہوتے ہیں خود کو زمین پر گراتے ہیں اور دو سو میٹر سینہ خیز چلتے ہیں تا کہ خود کو حرم تک پہنچائیں! کیا ایسا کرنا صحیح ہے، نہیں۔ یہ غلط کام ہے۔ یہ تو دین اور زیارت کی اہانت ہے۔ کون اس قسم کے بدعتوں کو لوگوں میں رائج کرتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ یہ کام دشمن کا ہو! یہ باتیں لوگوں کو سمجھائیں، اور ذھنوں کو اجاگر کریں۔

دین منطقی ہے۔ اسلام منطقی ہے اور اسلام کا منطقی ترین حصہ وہ تفسیر ہے جو کہ شیعہ اسلام کا ہے؛ ایک محکم تفسیر۔ شیعہ متکلمین اپنے اپنے زمانے میں آفتاب کی طرح چمکتے رہے اور کوئی انہیں نہیں کہہ سکتا تھا کہ "آپ کی منطق کمزور ہے" یہ متکلمین، چاہے ائمہ علیہم السلام کے زمانے میں تھے۔ جیسے کہ "مومن طاق" اور "ھشام بن حکم" چاہے ائمہ علیہم السلام کے زمانے کے بعد "بنی نوبخت" اور "شیخ مفید" جیسے اور چاہے ان کے بعد والے زمانے میں مرحوم "علّامہ حلی" جیسے بہت زیادہ تھے۔

ہم منطق واستدلال والے ہیں، آپ دیکھیں شیعت کے بارے میں کیسی استدلالی محکم کتابیں لکھی گئ ہیں! ہمارے زمانے میں مرحوم "عبدالحسین شرف الدین" کی کتابیں اور مرحوم "علّامہ عبدالحسین امینی" کی "الغدیر" سرتاپا

استدلالوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ تشیع ہے یا وہ مطالب اور موضوعات کہ جن کے لئے نہ صرف استدلال نہیں ہے بلکہ خرافات سے بھرے ہیں" اشبہ شی بلخرافہ"! کیوں ان کو لاتے ہیں! یہ بہت بڑا خطرہ ہے جسکا خیال دین اور دینی معارف کے سرحدوں کی حفاظت کرنے والے علماء کو رکھنا ہے۔

البتہ؛ کچھ لوگ جب یہ باتیں سنیں گے، یقیناً ہمدردی سے ضرور کہیں گے" آج فلاں کو ان باتوں کو نہیں چھیڑنا تھا" نہیں؛ مجھے یہ کہنا چاہئے تھا۔ میں یہ باتیں ضرور کرتا رہوں گا۔ میری مسئولیت دوسروں سے زیادہ ہے۔ البتہ دیگر حضرات کو بھی ایسا کہنا چاہئے۔ آپ حضرات بھی ضرور کہیں۔ بزرگوار امام ایسے خط شکن تھے کہ جہاں کہیں بھی انحراف پاتے تھے، پوری قدرت کے ساتھ اور کسی لحاظ کے بغیر اسے بیان فرماتے تھے۔ اگر ایسی بدعت اور خلافکاری اس بزرگوار کے زمانے میں ہوتی یا اس حد تک پہنچی ہوتی، بے شک اسے بیان کرتے۔ البتہ جن لوگوں کا ان کاموں سے دل لگا تھا ان کو تکلیف ہوگی کہ کیوں فلاں نے ہماری پسندیدہ کام کو اس طرح بے دردی اور اس لہجہ کے ساتھ بیان کیا۔ وہ بھی اکثر مؤمن، سچے اور بے غرض لوگ ہیں؛ لیکن غلط کرتے ہیں۔

جو سب سے بڑی ذمہ داری روحانین اور علماء حضرات پر، ہر بخش میں اور ہر جگہ پر ضروری طور عائد ہوتی ہے وہی ہے جو کچھ عرض کیا گیا۔ عزائے حسین علیہ الصلاۃ والسلام کی مجلس، ایسی مجلس ہونی چاہئے جس سے معرفت حاصل ہو اور ان تین خوبیوں کا کہ جن کو عرض کیا گیا کے نکھرنے کا مرکز ہونا چاہئے۔

امید کرتا ہوں کہ خداوند متعال آپ کو کامیاب رکھے تا کہ جو کچھ پروردگار کی رضایت کا سبب ہے اسے قدرت، شجاعت، تلاش و کوشش اور جہد مسلسل کے ساتھ بیان کریں اور انشاالله اپنی ذمہ واری کو انجام تک پہنچائیں۔

والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته.

اہل بیتؑ کے حقوق اہل سنت کی تفسیروں میں

محمد یعقوب بشوی
ترجمہ وتلخیص: حجۃ الاسلام مولانا سید مختار حسین جعفری

حق خمس

خداوند متعال سورہ ءانفال میں خمس کو اہل بیت (ع) کا حق شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے: **واعلموا انما غنمتم من شیئ فان للہ خمسہ و للرسول و لذی القربی و الیتمی و المساکین و ابن السبیل ان کنتم آمنتم باللہ** (انفال/۴۱)

جان لو کہ تمہیں جو بھی منفعت حاصل ہوتی ہے اس میں سے پانچواں حصہ، اللہ، رسول (ص) اور رسول (ص) کے قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور سفر میں خالی ہاتھ ہوجانے والے مسافروں کا ہے بشرطیکہ تم اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔

خمس کا مطلب:

اہل بیت (ع) کے لیے جو مادی حقوق رکھے گئے ہیں ان میں سے ایک حق خمس ہے۔ خمس قرآن مجید کا ایک تاکیدی دستور ہے۔ یہ آیت جنگ بدر میں نازل ہوئی تھی۔ لیکن شان نزول کی وجہ سے اس کا حکم مخصوص نہیں ہوجاتا بلکہ یہ ایک ایسا عمومی حکم ہے جو ہر طرح کے مال غنیمت کو شامل ہے۔ اسلام نے زکات اور صدقے کو عام ضرورتمند افراد کے لیے رکھا ہے لیکن ان دو چیزوں کو پیغمبر (ص) کی اولاد پر حرام قرار دیا ہے اور اس کے بدلے میں خمس کو ان کے لیے رکھا ہے اس لیے کہ زکات اور صدقہ مال کا میل ہوتا ہے۔

پیغمبر اکرم (ص) کی حیات مبارکہ میں خمس آپ کی اولاد کے درمیان تقسیم ہوتا تھا، لیکن آپ (ص) کی رحلت کے بعد خلفائے ثلاثہ نے پیغمبر (ص) کے قرابتداروں کو اس سے محروم کردیا۔ قابل ذکر ہے کہ خمس کا تعلق ہر چیز سے ہے، اور آیت میں جو من شئ کا استعمال ہوا ہے وہ اسی چیز پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح غنیمت کا مفہوم بھی ایک وسیع مفہوم ہے۔

غنیمت کا لغوی مطلب:

راغب کہتا ہے؛ غنمتم، گوسفند تک دسترسی حاصل ہوجانے کو کہتے ہیں، اس کے بعد اس کا اطلاق ہر اس

غنیمت پر ہوا ہے کہ جو دشمنوں وغیرہ سے حاصل ہو، **و اعلموا انما غنمتم من شیئ ۔۔۔۔** کا مطلب یہی ہے (مفردات؛ مادہ غ، ن، م) بغیر محنت کے کسی چیز کا حاصل ہو جانا غنیمت کہلاتا ہے، تاج العروس اور لسان العرب میں بھی اس کا یہی مطلب بیان کیا گیا ہے اہل سنت کی روایات اور ان کے بعض فتاویٰ میں بھی غنیمت سے مراد جنگی غنیمت سمیت ہر غنیمت کو لیا گیا ہے کہ آگے جس کو ہم بیان کریں گے۔ پیغمبر (ص) کے بعض قبیلوں اور شخصیتوں کے نام خطوط میں کہ جن میں آپ (ص) نے خمس کی ادائیگی کی تاکید کی ہے یہی مطلب مراد لیا گیا ہے۔

خمس کا فلسفہ:

حضرت علی (ع) سے روایت کی گئی ہے کہ آپ (ع) نے فرمایا: خدا نے صدقے کو رسول خدا (ص) پر حرام کیا اور اس کے بدلے میں خمس میں سے آپ (ص) کا حصہ قرار دیا اور اسی طرح تمام مسلمانوں میں سے صدقے کو صرف پیغمبر (ص) کے اہل بیت (ع) پر حرام کیا گیا اور اس کے بدلے میں رسول خدا (ص) کے ساتھ ان کے لیے خمس میں سے حصہ رکھا گیا۔ (الدر المنثور، ج ۳ ص ۱۸۶)

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ رسول خدا (ص) نے فرمایا: میں نے لوگوں کے ہاتھ کے میلے پانی کو آپ اہل بیت (ع) کے لیے پسند نہیں کیا، چونکہ خمس کا پانچواں حصہ آپ کے لیے کافی ہے اور وہ آپ کو بے نیاز کر دے گا۔ (گذشتہ حوالہ)

مجاہد سے روایت کی گئی ہے کہ وہ کہتے تھے: خدا جانتا تھا کہ بنی ہاشم کے درمیان بھی کچھ فقیر اور نادار ہوں گے، لہذا اس نے بنی ہاشم کے لیے صدقے کے بجائے خمس کو رکھا ہے (جامع البیان، ج ۶ ص ۵)

ان روایات اور ان جیسی دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ خمس کا فلسفہ خاندان پیغمبر (ص) کے لیے ایک اقتصادی نظام کی تشکیل ہے تاکہ وہ امت کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں اور ان کی عزت پر حرف نہ آئے۔

ذی القربی، آل محمدؐ

ابن دیلمی کہتا ہے: علی ابن الحسین رضی اللہ عنہ نے ایک شامی سے فرمایا: کیا تم نے سورۂ انفال میں نہیں پڑھا ہے، **و اعلموا انما غنمتم من شیئ فان للہ خمسہ و للرسول ۔۔۔۔** الخ؟ کہا: ہاں! پھر وہ بولا کیا وہ آپ ہیں؟ فرمایا: ہاں! (گذشتہ حوالہ)

مجاہد کہتا ہے: ذی القربی سے مراد رسول خدا (ص) کے قرابتدار ہیں کہ جن کے اوپر صدقہ حرام ہے (گذشتہ حوالہ)

ان دو روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ذی القربی آل محمد (ع) ہیں کہ جن پر صدقہ حرام ہے۔ طبری لکھتا ہے:

بعض کہتے ہیں: ذی القربی بنی ہاشم میں سے رسول خدا (ص) کے قرابتدار ہیں (گذشتہ حوالہ) اسی نظریے کو امام مالک، ثوری، اوراوزاعی وغیرہ نے بھی قبول کیا ہے (الجامع لاحکام القرآن، ج۸ ص ۱۲؛ فتح القدیر، ج ۲ ص ۳۷۷)

خمس آل محمد (ع) کا حق ہے،

مجاہد کہتا ہے: آل محمد (ع) کے لیے صدقہ حلال نہیں تھا لہذا پیغمبر (ص) نے ان کے لیے خمس کو مقرر فرمایا (جامع البیان، ج۶ ص ۵)

اہل سنت کا ایک بزرگ مفسر نیشاپوری لکھتا ہے: کہا گیا ہے خمس سارے کا سارا قرابتداروں کے لیے ہے، اسی بنا پر حضرت علی علیہ السلام سے رایت کی گئی ہے کہ حضرت نے اس قول کے جواب میں کہ آیت میں خدا نے یتامی اور مساکین کا بھی ذکر کیا ہے، فرمایا اس سے مراد ہمارے شیعہ یتیم اور مساکین ہیں۔

(غرائب القرآن، ج ۳ ص ۴۰۲)

امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے آپ نے فرمایا: یقیناً خمس ہمارے لیے ہے۔ حضرت سے کہا گیا کہ خدا فرماتا ہے؛ **و الیتامی و المساکین و ابن السبیل ۔۔۔**، فرمایا: ہمارے شیعہ، ہمارے فقیر اور سفر میں پھنسے ہوئے ہمارے شیعہ مراد ہیں۔ (فتح القدیر، ج ۲ ص ۳۷۶)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خمس سارے کا سارا آل محمد (ع) کا ہے اور ان ہی کا حق ہے۔

ایک اور روایت میں علی ابن ابی طالب (ع) سے آیۂ؛ **واعلموا انما غنمتم من شیئ فان للہ خمسہ** الخ کے بارے میں آیا ہے کہ آپ (ع) نے فرمایا: یہ خمس ہم سے مخصوص ہے چونکہ ہمارے لیے زکات میں سے حصہ نہیں رکھا گیا ہے خدا کے پیغمبر (ص) اور ان کی آل کو کرامت بخشنے کی وجہ سے، اس نے ہمیں عزت بخشی اور لوگوں کے ہاتھوں کے میل سے ہمیں دور رکھا (شواہد التنزیل، ج ۱ ص ۲۱۹)

منہال ابن عمرو کہتا ہے: میں نے عبداللہ ابن محمد ابن علی اور علی ابن الحسین (ع) سے پوچھا کہ خمس کس کے لیے ہے؟ فرمایا: خمس ہمارے لیے ہے، میں نے علی (ع) سے کہا: خدا فرماتا ہے **و الیتمی والمساکین وابن السبیل ۔۔۔**؛ فرمایا: اس سے مراد ہمارے یتیم اور فقیر ہیں۔

(جامع البیان، ج۶ ص ۸؛ تفسیر القرآن العظیم، ج ۲ ص ۳۲۴؛ الکشاف ج ۲ ص ۱۳۷)

صحیح بخاری میں آیا ہے؛ حضرت فاطمہ زہراء (س) نے ابوبکر سے خیبر کا خمس طلب کیا ابوبکر نے انکار کر دیا حضرت فاطمہ زہراء (س) ناراض ہوگئیں اور مرتے دم تک ابوبکر سے بات نہیں کی۔

(صحیح بخاری، ج ۵ ص ۱۷۷)

پیغمبر اکرم (ص) کے زمانے میں خمس کی تقسیم،

اہل سنت کی کتابوں میں بہت ساری معتبر روایتیں ملتی ہیں حضرت خمس کو اسی طرح کہ جیسا قرآن کی آیت میں ذکر ہوا ہے تقسیم کیا کرتے تھے۔ابو عالیہ ریاحی نے کہا: غنیمت کو پیغمبر (ص) کی خدمت میں لایا گیا، حضرت نے اس کو لیا اور پانچ حصوں میں تقسیم کیا، خدا کا حصہ، رسول کا حصہ، قرابتداروں کا حصہ، یتیموں کا حصہ، فقیروں کا حصہ اور مسافروں کا حصہ، (جامع البیان، ج ص ۴؛ الدر المنثور، ج ۴ ص ۶۶؛ تفسیر الفخر الرازی، ج ۱۵ ص ۱۷۱؛ تفسیر القرآن العظیم، ج ۲ ص ۳۲۳؛ بعض منابع میں آیا ہے کہ حضرت نے خمس کو چھ حصوں میں تقسیم کیا)

ابن عباس کہتے ہیں: خمس کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا خدا اور رسول خدا کے لیے دو حصے، پیغمبر (ص) کے قرابتداروں کے لیے ایک حصہ، یہاں تک کہ اسی روش پر پیغمبر (ص) کی دنیا سے رحلت ہوگئی (الکشاف، ج ۲ ص ۱۳۷؛ غرائب القرآن، ج ۳ ص ۴۰۲؛ تفسیر نسفی، ج ۱ ص ۶۴۶)

اہل سنت کی تمام روایات میں تصریح کی گئی ہے کہ پیغمبر اکرم (ص) کے زمانے میں لگاتار قرابتداروں کا حصہ دیا جاتا تھا اور آیت کی روشنی میں خمس کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا، اور پیغمبر (ص) کی یہی سنت اور روش تھی یہاں تک کہ آپ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔

ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ رسول خدا (ص) کے زمانے میں خمس کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا خدا اور رسول کا ایک حصہ، قرابتداروں کا ایک حصہ، اور باقی تین حصے یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے درمیان تقسیم کیے جاتے تھے۔اس کے بعد ابو بکر اور عمر اور عثمان نے خمس کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور پیغمبر (ص) اور قرابتداروں کا حصہ ساقط کر دیا، اور یتیموں، مسکینوں اور قرابتداروں کے حصے کو باقی رکھا (ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۹)

پیغمبر (ص) کے زمانے میں خمس قرابتداروں کو دیا جاتا تھا اور بغیر کسی تبدیلی کے یہ سلسلہ پیغمبر (ص) کے زمانے میں جاری رہا، یہاں تک کہ حضرت کی دنیا سے رحلت ہوگئی۔پیغمبر اکرم (ص) کی رحلت کے بعد یہ ابو بکر اور عمر کا اجتہاد تھا کہ خمس کو حضرت فاطمہ (س) اور بنی ہاشم سے چھین لیا۔(شرح نہج البلاغہ، ج ۱۶ ص ۲۳۱)

خلفاء کے زمانے میں خمس کی تقسیم:

ابن عباس سے روایت ہے کہ خمس کے چھ حصے تھے، خدا کا حصہ، رسول خدا کا حصہ، قرابتداروں کا حصہ، جب تک کہ پیغمبر (ص) کی رحلت ہوئی، آپ (ص) کے بعد ابو بکر نے خمس کے صرف تین حصے باقی رکھے

،یعنی یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے،،اور عمر اور بعد کے خلفاء بھی یہی سلوک کرتے رہے (الکشاف، ج ۲ ص ۱۳۷؛ تفسیر نسفی، ج ۱ ص ۶۴۶؛ غرائب القرآن،، ج ۳ ص ۴۰۲) روایت میں ہے کہ ابوبکر نے بنی ہاشم کو خمس دینے سے منع کر دیا، (الکشاف، ج ۳ ص ۱۳۷) ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ابوبکر نے فاطمہ (س) اور بنی ہاشم کو خمس دینے سے منع کر دیا۔ (شرح نہج البلاغہ، ج ۱۶ ص ۲۳۱)

ابن ابی الحدید معتزلی نے انس ابن مالک سے ایک روایت نقل کی ہے کہ اس نے کہا: فاطمہ (س) ابوبکر کے پاس آئیں اور فرمایا: جو ظلم وستم ہم اہل بیت پر ہوا ہے کیا تمہیں اس کا پتہ ہے، خدا نے ذی القربی کا حصہ اس آیت میں، **و اعلموا انما غنمتم من شیئ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی۔۔۔** ہمارے لیے مقرر فرمایا ہے وہ ہمیں دے دو۔ ابوبکر نے جواب دیا؛ جی ہاں! میں نے بھی اس آیت کو قرآن مجید میں پڑھا ہے جیسا کہ آپ پڑھ رہی ہیں، لیکن میں اس آیت سے اس نتیجے پر نہیں پہنچا ہوں کہ خمس میں سے قرابتداروں کا حصہ سارا آپ کو دے دوں!

حضرت فاطمہ (س) نے فرمایا: تو کیا یہ حصہ تیرا اور تیرے قرابتداروں کا ہے؟

ابوبکر نے جواب دیا: نہیں، بلکہ اس میں سے میں کچھ آپ کو دوں گا، اور جو باقی بچے گا اسے مسلمانوں کی فلاح کے لیے خرچ کروں گا!

حضرت فاطمہ (س) نے فرمایا: یہ خدا کا حکم نہیں ہے،

ابوبکر نے جواب دیا: یہی خدا کا حکم ہے! (گذشتہ حوالہ، ص ۲۳۰)

یہ روایت اس کی دوسری روایت کے ساتھ ٹکراتی ہے؛ جیسا کہ ابن عباس نے روایت کی ہے کہ پیغمبر (ص) کی وفات کے بعد ابوبکر نے قرابتداروں کا حصہ مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دیا؛ اس لیے کہ پیغمبر خدا (ص) نے فرمایا: لانورث ماترکناہ صدقہ۔ (جامع البیان، ج ۶ ص ۵)

خمس کی تقسیم میں خلفاء کے سلوک کا جائزہ:

۱۔ قرابتداروں کا خمس قرآن مجید کے اہم احکام میں سے ہے، جس کو بغیر دلیل کے مخصوص نہیں کیا جا سکتا، قرآنی عمومات کو صرف قطعی روایات ہی مخصوص کر سکتی ہیں۔ جب کہ اس روایت کو صرف ابوبکر نے نقل کیا ہے (شرح نہج البلاغہ، ج ۱۶ ص ۲۲۱، ۲۷) اور وہ خبر واحد ہے۔

۲۔ قرابتداروں کے حصے کا پیغمبر (ص) کی میراث سے کوئی ربط نہیں ہے کیا قرابتداروں کی ملکیتیں بھی میت کی میراث میں شامل ہو سکتی ہیں؟

۳۔اگر خمس پیغمبر (ص) کی میراث میں شامل تھا تو کیوں ابوبکر نے اس میں سے کچھ فاطمہ (س) کو دینے کا فیصلہ کیا؟ اس لیے کہ یہ ان کے عقیدے میں صدقہ ہے اور صدقہ آل محمدؐ پر حرام ہے؟

(جامع البیان، ج۶ ص ۵)

۴۔ یہ روایت دوسری روایتوں سے ٹکراتی ہے کہ جن میں ابوبکر نے خود قبول کیا ہے کہ خاندان پیغمبر (ص) کے فقیروں کو خمس دیا جانا چاہیے، جیسا کہ روایت کی گئی ہے کہ ابوبکر نے بنی ہاشم کو خمس دینے سے منع کر دیا اور کہا: اس خمس میں سے تمہارے فقیروں کو اور تمہاری کنیزوں کی شادیوں کے لیے اور تم میں سے اس کو کہ جس کے پاس خادم نہیں ہے دوں گا۔ (غرائب القرآن، ج ۳ ص ۴۰۲)

اگر خمس صدقہ ہو تو کس طرح اس کو خاندان پیغمبر (ص) کے لیے جائز قرار دیا جب کہ بہت ساری روایات میں آیا ہے کہ صدقہ اور زکات لوگوں کے ہاتھ کا میل ہے، اور اسی وجہ سے خداوند عالم نے آل محمدؐ کے لیے خمس رکھا ہے (الدر المنثور، ج ۳ ص ۱۸۶) اس کے علاوہ کچھ روایات میں ابی الحدید نے نقل کیا ہے کہ ابوبکر نے اقرار کیا کہ قرابتداروں کے حصے میں سے کچھ فاطمہ (س) کو دے گا، دوسری حدیث، ماتر کناہ صدقہ کے مطابق، کیسے ابوبکر صدقہ فاطمہ زہراء (س) کو دے سکتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرابتداروں کے حصے کا صدقے سے کوئی ربط نہیں ہے۔

۵۔خمس زکات اور صدقے کے مقابلے میں ہے۔جیسا کہ بہت ساری روایات میں نقل ہوا ہے (گذشتہ حوالہ، جامع البیان، ج۶ ص ۵) جو چیز کسی دوسری چیز کی جانشین ہوتی ہے اس کو حکم اولی کی حامل نہیں ہونا چاہیے۔خمس خاندان پیغمبر (ص) کے لیے ایک مستقل اقتصادی، مالی نظام ہے، جیسا کہ زکات، امت کے لیے ایک مستقل مالی، اقتصادی نظام ہے۔پس خمس نہ صدقہ ہے اور نہ پیغمبر (ص) کی میراث بلکہ خدا کا حکم ہے، اور بالفرض کہ یہ حدیث صحیح بھی ہو تو بھی اس کا خمس سے کوئی ربط نہیں ہے۔

۶۔بعض روایات کی صراحت کے مطابق حضرت علی علیہ السلام خلفاء کے اس نظریے کے خلاف تھے اور اس کو اہل بیت (ع) کا حق مانتے تھے؛ چنانچہ محمد ابن اسحاق نے امام محمد باقر (ع) سے پوچھا: خمس کے بارے میں حضرت کرم اللہ وجہہ کی رائے کیا تھی؟ فرمایا: ان کی رائے وہی اہل بیت (ع) کی رائے تھی (کتاب الخراج، ص ۲۰)

۷۔عمر ابن عبدالعزیز بنی امیہ کا سب سے عادل حکمران تھا۔اس نے اپنی حکومت کے زمانے میں پیغمبر (ص) اور قرابتداروں کا حصہ بنی ہاشم کے لیے بھیجا۔(گذشتہ، ص ۲۱) اگر پہلے خلیفہ کا استدلال درست ہوتا تو وہ بھی یقیناً ابوبکر کی سیرت کے مطابق عمل کرتا۔

۸۔ابوداوود نے جبیر ابن مطعم سے یہ روایت نقل کی ہے: ابوبکر خمس کو رسول خداؐ کی طرح تقسیم کرتے تھے ،لیکن رسول خدا کے قربتداروں کا حصہ جس طرح رسول خدا (ص) دیا کرتے تھے اس طرح انہوں نے نہیں دیا۔(ابی داوود، سنن ابی داوود، ج ۳ ص ۱۴۵)

پیغمبر اکرم (ص) رشتے داروں کو خمس دیتے تھے،لیکن ابوبکر نے اس سے انکار کر دیا، پس کیسے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ وہ خمس کو پیغمبر (ص) کی طرح تقسیم کرتے تھے؟

۹۔ابوبکر اور دوسرے خلفاء نے کس طرح قرابتداروں کے حق کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کیا؛ جب کہ پیغمبر (ص) کے زمانے میں خمس بنی ہاشم سے مخصوص تھا اور حضرت نے عملی طور پر خمس کو دوسروں کو دینے سے منع کیا تھا؛ چنانچہ جبیر ابن مطعم نے روایت کی ہے؛ رسول خدا (ص) نے قرابتداروں کے حصے کو بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے درمیان تقسیم کیا؛ راوی کہتا ہے؛ میں اور عثمان ابن عفان حضور کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی؛ یارسول اللہؐ! بنی ہاشم آپ کے بھائی ہیں اور خدا نے ان کے درمیان جو فضیلت آپ کو عطا کی ہے وہ ناقابل انکار ہے،تو کیا بنی مطلب میں سے ہمارے بھائیوں کو حصہ دیں گے اور ہمیں نہیں دیں گے جب کہ رشتے داری کے لحاظ سے ہم اور وہ ایک رتبے میں ہیں؟ فرمایا؛ وہ جاہلیت میں بھی اور اسلام لانے کے بعد بھی ہم سے جدا نہیں تھے۔(الدرالمنثور، ج ۴ ص ۶۹)

اتنی ساری روایات اور رسول اکرم (ص) کی سیرت کے ہوتے ہوئے آیا قرابتداروں کو خمس نہ دینا نص کے مقابلے میں اجتہاد نہیں ہے؟

قرابتداروں کا حصہ:

پیغمبر (ص) کے زمانے میں خمس میں سے قرابتداروں کا حصہ معین تھا اور حضرت اپنی وفات تک خمس میں سے قرابتداروں کا حصہ دیا کرتے تھے۔

اہل سنت کا ایک بزرگ فقیہ ابن قدامہ لکھتا ہے؛ پیغمبر اکرم (ص) کی رحلت کے بعد ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے قرابتداروں کے حصے کو فی سبیل اللہ میں ضم کر دیا، ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ یقیناً ابوبکر اور عمر نے خمس کے تین حصے کر دیے؛ اس کے بعد لکھتا ہے؛ احمد ابن حنبل سے کہا گیا کہ ابوبکر اور عمر نے قرابت داروں کے حصے کو فی سبیل اللہ میں ضم کر دیا تو وہ خاموش رہے لیکن سر ہلا کر تائید کی ،لیکن اس نے اس مذہب کو ترک کر دیا۔اس نے دیکھا کہ قرابتداروں کے حصے کے بارے میں ابن عباس اور ان کے موافقین کا قول دوسروں سے بہتر کتاب وسنت رسول خدا کے مطابق ہے؛،اس لیے کہ ابن عباس سے قرابتداروں کے حصے کے بارے میں پوچھا گیا،تو انہوں نے کہا: ہم یہ سوچتے تھے کہ قرابتداروں کا حصہ ہمارا ہے۔لیکن ہماری قوم

نے قرابتداروں کا حصہ ہمیں دینے سے انکار کر دیا۔

ابن قدامہ لکھتا ہے: اس جملے ؛فابی ذلك علينا قومنا ، سے مراد یہ ہے کہ ابوبکر اور عمر اور وہ لوگ جو ان کی پیروی کرتے تھے انہوں نے قرابتداروں کے حصے کو فی سبیل اللہ میں ضم کر دیا جب کہ ان عباس کا قول زیادہ مناسب اور کتاب وسنت کے زیادہ موافق ہے (المغنی، ج ۶ ص ۴۰۶، ۴۰۷) اہل سنت کا بزرگ فقیہ ابن قدامہ لکھتا ہے ؛ پیغمبر (ص) کی رحلت کے بعد قرابتداروں کا حصہ ثابت ہے، خدا نے قرآن میں قرابتداروں کے حصے کا ذکر کیا ہے، اور یہ بات ثابت ہے کہ پیغمبرؐ قرابتداروں کو ان کا حصہ دیا کرتے تھے، اس کے بعد مطعم کی حدیث ذکر کی ہے اور کہا ہے؛ یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی ہے اور یہ حکم بدلا نہیں ہے، پس قرابتداروں کا حصہ دینا اور حکم کے مطابق عمل کرنا واجب ہے (گذشتہ حوالہ، ص ۴۱۰)

ابن قدامہ بہت سارے اہل سنت کے فقہاء کے برخلاف قرابتداروں کے لیے خمس کے واجب ہونے اور اس حکم پر عمل کے واجب ہونے کا معتقد ہے، صحابہ شریعت کے حکم میں تصرف اور اس کو بدلنے کا حق نہیں رکھتے۔ ان کا یہ کام آیت کی صراحت اور پیغمبر (ص) کی سنت متواتر اور مستمر کے ہوتے ہوئے علمی اور شرعی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ نص کے مقابلے میں اجتہاد ہے۔

پیغمبر (ص) کی رحلت کے بعد نہ صرف قرابتداروں کو خمس نہیں دیا گیا بلکہ قرابتداروں کے مصداق کو بھی بدلنے کی کوشش کی گئی، چنانچہ سعید ابن مقبری سے نقل ہوا ہے کہ نجدہ نے ابن عباس کو خط لکھا اور ان سے قرابتداروں کے بارے میں پوچھا: ابن عباس نے ان کے جواب میں لکھا: ہم یہ کہا کرتے تھے کہ قرابتدار ہم ہیں لیکن ہماری قوم نے اس کا انکار کیا اور کہا: قريش كلها ذى القربى ، قریش سب کے سب قرابتدار ہیں۔

روایات میں دقت سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کی سیرت اور ان کی باتوں میں بہت ٹکراؤ ہے، قاضی ابو یوسف لکھتا ہے: خمس کو پیغمبر (ص) کے زمانے میں پانچ حصوں میں بانٹا جاتا تھا؛ خدا اور رسولؐ کا ایک حصہ، اور قرابتداروں کا ایک حصہ تھا اور یتیموں مسکینوں اور مسافروں کا ایک ایک حصہ تھا۔ اس کے بعد ابوبکر عمر اور عثمان آئے اور انہوں نے خمس کے تین حصے کر کے قرابتداروں کے حصے کو ختم کر دیا۔ (کتاب الخراج، ص ۱۹)

امام شافعی نے قرابتداروں کے حصے کو تسلیم کیا ہے، امام فخر رازی لکھتے ہیں: جان لیجیے کہ آیت کا ظاہر قول شافعی کے مطابق ہے اور صاف اس کے حق میں ہے پس اس کا انکار جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ آیت کی شکل میں کوئی اور منفصل اور قوی دلیل موجود ہو۔ ایسا کیسے ممکن ہے جب کہ آیت کے آخر میں کہا ہے؛ ان كنتم آمنتم بالله یعنی اگر تم خدا پر ایمان رکھتے ہو تو اس کے حصے کے بارے میں حکم صادر کرو، یہ اس امر کی دلیل

ہے کہ جب تک اس حصے کا حکم صادر نہیں کرو گے ایمان حاصل نہیں ہوگا۔

(تفسیر الفخر الرازی، ج ۱۵، ص ۱۷۰، ۱۷۱)

غنائم جنگی کے علاوہ دیگر اموال میں خمس:

حسن نے کہا ہے: عنبر اور لوء لوء میں خمس ہے۔؛ اس لیے کہ پیغمبر (ص) نے زکات میں خمس رکھا ہے (صحیح البخاری، ج ۲ ص ۱۵۹، ۱۶۰) مالک اور ابن ادریس کا کہنا ہے؛ ان چیزوں میں زکات ہے جن کو جاہلیت کے زمانے میں دفن کیا گیا تھا چاہے زیادہ ہو یا کم اس لیے کہ پیغمبر (ص) نے فرمایا ہے؛ زکات میں خمس ہے (گذشتہ حوالہ)

ابو ہریرہ کا بیان ہے: پیغمبر (ص) نے فرمایا: **و فی الزکات الخمس**، زکات میں خمس ہے، بعض لوگ کہتے ہیں؛ معدن (کان) زکات ہے اس چیز کی مانند جس کو جاہلیت کے زمانے میں دفن کیا جاتا تھا۔ (گذشتہ حوالہ)

پیغمبر (ص) نے جن چیزوں میں خمس کو واجب قرار دیا ہے ان میں ایک چیز زمین کے نیچے مدفون خزانے ہیں اور اس کے علاوہ معدنیات ہیں کہ جن کو زمین سے اخراج کیا جاتا ہے اور اس چیز کا تذکرہ متعدد روایات میں آیا ہے جن کو مالک ابن انس، ابن اثیر، جابر، عبداللہ ابن مسعود، ابو ہریرہ، ابو ثعلبہ الخشنی اور زید ابن ارقم نے مجمع الزوائد، المسند اور النھایہ فی غریب الاثر نامی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

پیغمبر (ص) کے خطوط میں خمس کا تذکرہ

جو قبیلے اور اشخاص ایمان لاتے تھے رسول خدا (ص) انہیں حکم دیتے تھے کہ ہر طرح کی منفعت سے خمس ادا کریں، ان خطوط کے چند نمونے یہاں ہم بطور اختصار ذکر کر رہے ہیں۔

۱۔ بخاری نے لکھا ہے: قبیلہء عبس القیس کا ایک وفد رسول خدا (ص) کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور کہا: ہمارے اور آپ کے درمیان کچھ مشرک بھی رہتے ہیں، اسی لیے ہم حرمت کے مہینوں کے علاوہ آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتے، پس ہمیں کوئی ایسا دستور دیجیے کہ جس پر عمل کر کے ہم جنت میں داخل ہو سکیں اور اپنے قبیلے کے لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دیں۔ حضرت (ص) نے فرمایا کہ میں تمہیں چار چیزوں کے انجام دینے اور چار چیزوں سے دور رہنے کا حکم دیتا ہوں؛ خدا پر ایمان لائیں کہ جو کلمۂ لا الہ الا اللہ ہے، نماز قائم کریں، زکات ادا کریں اور جو منافع تم کو حاصل ہوتے ہیں ان کا خمس ادا کریں۔ (صحیح البخاری، ج ۹ ص ۱۹۷)

اس روایت میں منافع سے مراد جنگی غنائم نہیں ہیں، اس لیے کہ سوال کرنے والا وہ شخص ہے کہ جو حرمت

کے مہینوں کے علاوہ مشرکوں کے خوف سے اپنی سرزمین سے نکلنے کی جرائت نہیں کر پاتا تھا؛ اور حرمت والے مہینوں میں جنگ حرام تھی، پس بلا شک غنیمت سے مراد عام فائدہ ہے جو ہر طرح کے فائدے کو شامل ہے۔

۲۔ رسول خدا (ص) نے قضاعہ اور جذام کے ایک شخص کو خط لکھا اور ان کو صدقے کے واجبات کی تعلیم دی اور انہیں خمس وزکات کی ادائیگی کا حکم دیا۔ (محمد ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج۱، ص ۱۸۴)

یہ بات واضح ہے کہ قبیلہء جذام اور سعد نے کفار کے ساتھ جنگ نہیں کی تھی کہ ان سے جنگ کی غنیمت کا مطالبہ کیا جاتا؛ جب مالک ابن احمد جذامی نے اسلام قبول کیا تو حضرت سے کہا کہ ایک خط لکھ کر اس کی قوم کو اسلام کی دعوت دیں۔ حضرت نے ایک خط لکھا، اور ان کو مشرکوں سے دوری اختیار کرنے اور حاصل ہونے والے فوائد میں سے خمس ادا کرنے کا حکم دیا۔ (لسان العرب۔ ج ۳ ص ۲۰)

۳۔ پیغمبر اکرم (ص) نے بنی جوین کو خط لکھا: جو شخص خدا پر ایمان لایا ہے وہ نماز پڑھے، زکات ادا کرے، مشرکوں سے دوری اختیار کرے اور خدا و رسولؐ کی اطاعت کرے اور تمام فوائد میں سے خدا کا پانچواں حصہ اور نبی (ص) کا حصہ ادا کرے۔ (طبقات الکبریٰ، ج۱ ص ۱۸۳، ۱۸۴)

۴۔ اسی مضمون کے خطوط آنحضرت (ص) نے بنی معاویہ بن جرول، جنادہ الازدی اور اس کی قوم اور اس کے ماننے والوں، عمرو ابن معبد الجھنی اور بنی حرقہ اور بنی جرمز، بنی وائل میں سے نہشل ابن مالک اور اس کے ساتھیوں، اور بنی زھیر بن اقیش کے نام روانہ کیے جن کا ذکر طبقات الکبریٰ ج۱، ص ۱۸۳ سے ۱۹۴ پر موجود ہے۔

غنائم جنگی کے علاوہ کے بارے میں فقہاء کے فتوے:

قاضی ابو یوسف (م ۱۸۲ق) کہتا ہے: غنیمت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ مال جو مشرکوں کے ساتھ جنگ سے حاصل ہوتا ہے اور دوسری وہ اموال جو بغیر جنگ کے معدنیات جیسے سونے چاندی لوہے، تانبے، پیتل وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں اور ان میں خمس ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ معدنیات عربوں کی زمینوں سے حاصل ہوں یا عجمیوں کی زمینوں سے۔

وہ آگے کہتا ہے: معدنیات میں سے جتنا کچھ بھی حاصل ہو چاہے وہ کم ہو یا زیادہ، اس میں خمس ہے چاہے، کسی کے پاس دوسو درہم سے کم مقدار میں چاندی اور بیس مثقال سے کم مقدار میں سونا ہو۔

(کتاب الخرائج، ص ۲۱)

خلاصہ:

فریقین کے نزدیک اہل بیت (ع) کی شناخت کا سب سے اہم ذریعہ قرآن وسنت ہے۔قرآن کریم میں متعدد عناوین کے تحت بہت ساری آیتیں ان کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔اہل بیت (ع) کے مصداق کی شناخت کے لیے اہم ترین آیت آیۂ تطہیر ہے،اور اہل سنت کی متعدد روایات کی روشنی میں اس کے نزول کا سبب اصحاب کساء ہیں۔اس امر کی گواہ اہل سنت کی متعدد صحیح السند روایات کے علاوہ اس آیت کے نزول کے بعد پیغمبر (ص) کی سیرت ہے، کہ مختلف روایات کے مطابق آپ (ص) ایک ماہ تک، چھ ماہ تک، سات ماہ تک، نو ماہ تک یا دس ماہ تک نماز کے وقت فاطمہ زہراء (س) کے گھر پر آتے تھے اور فرماتے تھے: الصلاۃ علیکم: انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا۔

اصحاب کساء کے حق میں آیۂ تطہیر کے ذیل میں روایات، آئمہ معصومین (ع) اصحاب گرامی، اور پیغمبر (ص) کی بیویوں سے نقل ہوئی ہیں، اور ان سب نے ان روایات سے استدلال کیا ہے، بتیس سے زیادہ علمائے اہل سنت نے بھی اس آیت کو اصحاب کساء سے مختص قرار دیا ہے۔

آیۂ تطہیر کے نزول کے بعد اپنی بیویوں؛ ام سلمہ، عایشہ، صفیہ، ام سلیم اور زینب کے ساتھ پیغمبر (ص) کا برتاو اس امر کا مضبوط گواہ ہے کہ یہ آیت پیغمبر (ص) کی بیویوں کو شامل نہیں ہے۔

وہ روایات جو حضرت کی بیویوں کو آیت میں شامل قرار دیتی ہیں وہ ضعیف ہیں اور قابل اعتنا نہیں ہیں۔ آیت تطہیر کے ماقبل اور مابعد کو دیکھتے ہوئے اور اسی طرح ان آیات کے سبب نزول کے پیش نظر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان دو طرح کی آیتوں کا سبب نزول جداگانہ ہے۔اسی طرح سورۂ حجرات کی آیت نمبر ۱۱ اور سورۂ تحریم کے سبب نزول پر توجہ مبذول کرنے سے کافی حد تک مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔لیکن بدقسمتی سے بہت سارے صاحبان نظر نے اس نکتے سے غفلت برتی ہے۔

پیغمبر اکرم (ص) کی سنت میں اہل بیت (ع) کا مقام انتہائی غیر معمولی ہے۔بہت ساری روایات جیسے حدیث ثقلین جو متواتر ہے، حدیث سفینہ، حدیث باب حطہ، اور حدیث امان وغیرہ اہل بیت (ع) کی عصمت اور رہبری کو ثابت کرتی ہیں، ان روایات اور دسیوں دوسری روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے سامنے کمال اور سعادت تک پہنچنے کے لیے اہل بیت (ع) کا دامن تھامنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔اور ان سے جدائی انسان کے لیے ہدایت کی چوٹی سے ظلمت اور گمراہی کی کھائی کی تہہ میں گرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

قرآن مجید میں اہل بیت (ع) کے لیے کچھ حقوق مقرر کیے گئے ہیں اور ان حقوق کی شناخت انسان کی سعادت اور نجات کے لیے بہت ضروری ہے اس لیے کہ اس کی سعادت اور نجات انہی حقوق کی شناخت میں

پوشیدہ ہے۔

اہل بیت (ع) کا ایک اہم ترین حق، حق ولایت ہے، جیسا کہ خود حضرت علی (ع) نے اس کو اہل بیت (ع) کے حقوق میں شمار کیا ہے، اور یہ ولایت، پیغمبرؐ اور آئمہ اہل بیت (ع) کی تصریح کے مطابق، زعامت اور رہبری ہے۔ ولی کا مطلب اولیٰ بالتصرف بھی ہے، آیۃ ولایت، اہل بیت (ع) کی ولایت اور رہبری پر دلالت کرتی ہے اور آیت میں ولی کا پہلا مصداق فریقین کی متعدد اور معتبر روایات کے مطابق امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ اس آیت کا سبب نزول بھی رکوع کی حالت میں سائل کو انگوٹھی دینا ہے۔ بعض علمائے اہل سنت نے اس مسئلے کے اجماعی ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ آیۂ ولایت کا غدیر خم کے مسئلے سے گہرا رابطہ ہے اور اہل سنت کے علماء کی نقل کے مطابق ولایت اور غدیر کی داستان کے بارے میں سات آیتیں نازل ہوئی ہیں، یہ تمام آیات اور روایات گواہی دیتی ہیں کہ ولایت سے مراد امت اسلامی کی زعامت اور رہبری ہے۔

اہل بیت (ع) کے معنوی حقوق میں سے ایک ان کی مودت ہے۔ بہت سارے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ آیۂ مودت مدینے میں نازل ہوئی تھی، اس آیت میں خدا کے حکم سے حضرت فاطمہؑ اور ان کے اہل بیت کی دوستی کو اجر رسالت قرار دیا گیا ہے، اور اہل سنت کی متعدد روایات کے مطابق ان کی محبت کو تمام امت اسلامی پر واجب قرار دیا گیا ہے۔ اس نوعیت کی روایات کو حضرت علی، امام حسن، اور امام زین العابدین (ع) جیسے بزرگوں، اور صحابہ اور تابعین جیسے ابن عباس، جابر، عبداللہ ابن مسعود، سعید ابن جبیر، سدی، اور عمرو ابن شعیب وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

البتہ اہل سنت کی تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں آیۂ مودت کے سلسلے میں کچھ احتمالات بیان کیے گئے ہیں، جیسے یہ کہ یہ آیت مسوخ ہو چکی ہے یا اس کا خطاب تمام قریش سے ہے، یا پیغمبرؐ کی مودت مراد ہے یا مومن رشتہ دار مراد ہیں، اس سے مراد خدا کا قرب ہے یا اس کا خطاب انصار سے ہے وغیرہ وغیرہ لیکن یہ سارے احتمالات بے دلیل دعوے ہیں اور آیت کا اصلی راستے سے انحراف ہے۔ اسی طرح ان نظریات کے درمیان تعارض اور تناقض دکھائی دیتا ہے اور ان کے جو بعض شان نزول ہیں ان کی روایات مجہول اور ضعیف ہیں۔

اہل بیت علیہم السلام کے معنوی حقوق میں سے ایک حق ان پر سلام اور درود بھیجنا ہے جو قرآن کے حکم کے مطابق قیامت تک پوری امت اسلامی پر واجب ہے کہ محمد اور ان کے اہل بیت (ع) پر درود بھیجیں۔ صلوات کی کیفیت اہل سنت کی متواتر نقل کے مطابق وہی جملہ **اللھم صل علی محمد و آل محمد** ہے اور تمام روایات میں قدر متیقن یہی ہے اور یہ وہی شیعوں والی صلوات ہے۔

خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق صلوات صرف اہل بیت علیہم السلام کے لیے ہے اور ان کے غیر کو اس میں شامل کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ وہ روایات جو پیغمبر (ص) کی بیویوں کے صلوات میں شامل ہونے کے سلسلے میں ہیں وہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں اور ان صحیح روایات کے ساتھ کہ جن میں صلوات کی کیفیت بیان کی گئی ہے متعارض ہیں۔ اسی طرح لفظ اہل بیتؑ کو صلوات سے حذف کرنا بھی پیغمبر (ص) کے حکم کی خلاف ورزی ہے اور جائز نہیں ہے۔ آیت صلوات کے شان نزول کو ۷۳ سے زیادہ صحابہ نے نقل کیا ہے اور ان میں محمدؐ و آل محمدؐ پر درود بھیجنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔

اہل سنت کی کتابوں میں اس شخص کے لیے کہ جو محمدؐ و آل محمد پر درود بھیجتا ہے ۶۴ دنیوی اور اخروی فائدے بیان کیے گئے ہیں۔

مالی حقوق میں سے اہل بیت (ع) کا ایک مسلم حق، حق فئ ہے فئ انہی چیزوں کو کہتے ہیں کہ جو جنگ کے بغیر پیغمبر (ص) کو حاصل ہوں، اس بنا پر فدک کا تعلق بھی فئ سے ہے۔ اور آیہ **و آت ذا القربی حقه** ۔۔۔۔ کے نزول کے بعد حضرت نے فدک فاطمہ (ص) کو دے دیا۔ فدک فاطمہ کا مسلم حق تھا، اور اہل سنت کی بہت ساری تفسیری روایات اس چیز پر تاکید کرتی ہیں۔

فاطمہ (س) نے فدک کی واپسی کے لیے قیام کیا اور ذی القربی کے حصے، اپنی ذاتی ملکیت اور باپ کی میراث کے طور پر اس پر استدلال کیا۔ حضرت فاطمہؑ کا استدلال قرآن کی بنیاد پر اور انتہائی قاطع ہے۔ حضرت فاطمہؑ کے دندان شکن استدلال کے مقابلے میں خلیفہ کا استدلال متناقض اور سست ہے اور صرف ایک خبر واحد ہے کہ جس کا راوی بھی وہ خود ہے۔ اہل سنت کے بعض علماء کے بقول یہ حدیث جعلی اور باطل ہے۔ آیات اور روایات کے مطابق انبیاءؑ اپنی میراث چھوڑ کر جاتے ہیں۔

اہل بیت (ع) کے مالی حقوق میں سے ایک حق خمس ہے۔ اہل سنت کی متعدد اور معتبر روایات کے مطابق پیغمبر (ص) خود اپنی حیات مبارکہ میں خمس اہل بیت (ع) کو دیا کرتے تھے اور ان کے درمیان تقسیم کیا کرتے تھے، اور عصر رسالت میں یہ ایک جانی پہچانی سنت تھی۔ اہل سنت کی متعدد روایات کے مطابق خمس حضرت فاطمہ (س) کا حق ہے جو پیغمبر (ص) کے زمانے میں تقسیم ہوتا تھا، لیکن حضرت (ص) کی رحلت کے بعد ابوبکر نے حضرت فاطمہ اور بنی ہاشم کو اس سے محروم کر دیا۔ اس بنا پر اس نے صاف طور پر قرآن اور رسول (ص) کی سیرت کی مخالفت کی، خمس ہر طرح کے مال میں واجب ہے، اس کی گواہ تفسیری روایات کے علاوہ پیغمبر (ص) کے خطوط اور اہل سنت کے فقہاء کے فتوے ہیں۔

دعا، امام زین العابدین (ع) کا دین کی روشنی پھیلانے کا ہتھیار

ترجمہ: حجۃ الاسلام مولانا سید مختار حسین جعفری

نزول قرآن کے بعد شیعوں کی پہلی کتاب:

کمال کی جانب انسان کی حرکت کی ابتدا انسان کے رجحانات اور میلانات کو صحیح ڈگر پر چلانے سے ہوتی ہے، اور دعا سے بڑھ کر کوئی ایسی طاقت نہیں ہے کہ جو انسان کے تمایلات کو سیدھے راستے پر لگا سکے۔

امام حسین (ع) کی امامت کے خاتمے کے بعد کہ جو واقعۂ عاشوراء اور اہل بیت (ع) کی اسارت کے ساتھ ختم ہوئی تھی، معاشرے کی سیاسی اور اجتماعی حالت بہت زیادہ افسوس ناک تھی۔ گویا پیغمبر (ص) کی رحلت کے پچاس سے زیادہ کچھ ہی برسوں کے بعد مکہ اور مدینہ کی وہی حالت ہوگئی تھی جو صدر اسلام میں تھی۔ اس زمانے میں معاشرے میں ظاہری طور پر بھی دین باقی نہیں بچا تھا اور اسلام کا صرف نام رہ گیا تھا۔

معاشرے میں عجیب طرح کی گھٹن تھی۔ اور امام زین العابدین علیہ السلام اس زمانے میں بالکل تنہا تھے، یہاں تک کہ ایک روایت میں اس زمانے کی حالت یوں بیان کی گئی ہے: مدینے میں فساد اس حد تک زیادہ ہو گیا تھا کہ اگر گانا گانے والی عورت مدینے سے باہر جاتی تھی تو لوگ اسے رخصت کرنے کے لیے دوڑے چلے آتے تھے اور اگر شہر میں آتی تھی تو اس کے استقبال کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے۔ اس زمانے کی اخلاقی گراوٹ کا ایک اور نمونہ یوں بیان کیا گیا ہے: مدینے کے اس دور کے معاشرے کی حالت یہ تھی کہ جب امام زین العابدینؑ واقعۂ حرہ کے دوران رسول خدا (ص) کی قبر نورانی کی زیارت کے لیے جانا چاہتے تھے تو کیا دیکھتے تھے کہ جن سپاہیوں نے مدینے پر حملہ کیا تھا انہوں نے روضۂ رسول (ص) کو اپنے گھوڑوں کا اصطبل بنا رکھا ہے۔

اس زمانے میں حکومت کا عجیب خوف لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا اور دوسری طرف حکومت نے بھی امام زین العابدین (ع) کو جان سے مارنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ایسے زمانے میں امام زین العابدین نے ایک ثقافتی جہاد شروع کرنے کا پروگرام بنایا جس کے میدان کے ہتھیاروں کے طور پر آپ نے افراد کی تربیت اور

دعا کو استعمال کیا۔

اس معاشرے میں کہ جو اجتماعی اصلاح کے قابل نہیں تھا افراد کی تربیت بہترین طریقہ تھا۔ امام زین العابدین (ع) نے اس امر کو انجام دینے کے لیے اپنی امامت کے دور میں کہ جو تیس سال کا دور تھا یہ سلسلہ شروع کیا تھا کہ آپ بہت سارے لوگوں کو غلام بنا کے لاتے تھے اور پھر ان کی تربیت کر کے انہیں آزاد کر دیتے تھے۔ اس طرح امام محمد باقر اور امام جعفر صادق (ع) کی کلاس میں جو ہزاروں افراد تھے اس کی بنیاد امام زین العابدین (ع) نے رکھی تھی۔ امام زین العابدین (ع) کا جو اہم ترین انفرادی پروگرام تھا وہ یہ تھا کہ آپ دعا پڑھنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔

انسان کے خواہشات اور میلانات کو قابو کرنے میں دعا کا کردار:

دعا ایک ایسا تربیتی وسیلہ ہے کہ جو انسان کو سب سے بدترین معاشرے میں سب سے خطرناک گرداب سے نکال سکتا ہے۔

دعا میں اتنی اچھی تاثیر کیوں اور کیسے ہے؟

اگر انسان شناسی کے زاویۂ نگاہ سے انسان پر نگاہ ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی حرکت اس کے تمایلات کے تابع ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان کی ضرورتیں بھی ایسا کردار نہیں رکھتیں، اس لیے کہ ممکن ہے کہ انسان اپنی کسی ضرورت کو نظر انداز کر دے اور اس کو پورا نہ کرے، یہاں تک کہ علم بھی انسان کی حرکت کا منشاء نہیں ہوسکتا، چونکہ ممکن ہے کہ انسان کو کسی بات کا علم ہو لیکن اس کو انجام دینے کا اس کے اندر محرک نہ ہو۔ انسان کی ضرورتیں اور اس کا علم اس وقت حرکت کا باعث بنتے ہیں کہ جب ان کو پورا کرنے کا محرک ان کے ساتھ موجود ہو۔

پس انسان کو چاہیے کہ اپنے تمایلات ور رجحانات کو پہچانے، اور نیک خواہشات اور بری خواہشات دونوں کو خدا کے سامنے رکھے اور اپنے پروردگار سے ان کو قابو میں رکھنے کی مدد مانگے۔ ضروری ہے کہ انسان اپنی سعادت کے لیے بعض خواہشات کا گلا گھونٹے، اور اپنی بعض نیک خواہشات کو تقویت دے، بعض خواہشات کو اکتسابی طور پر اپنے اندر پیدا کرے اور اپنی بعض خفتہ خواہشات کو بیدار کرے۔

مجموعی طور پر کمال کی جانب انسان کی حرکت خواہشات اور رجحانات کو صحیح طریقے سے بس میں کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ تندرست اور طاقتور انسان اپنے تمایلات کو بس میں کر سکتا ہے۔ اور دعا سے بہتر کوئی چیز بھی انسانی خواہشات کو صحیح راستے پر نہیں چلا سکتی۔

امام زین العابدین (ع) کی مناجات کا ایک نمونہ کہ جس میں خواہشات کو مہار کرنے کا طریقہ موجیں مارتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

یا منی قلوب المشتاقین و یا غایة آمال المحبین اے شوق سے سرشار دلوں کی آرزو! اور اے عاشقوں کے دلوں کی آخری امید؛

اسئلك حبك و حب من یحبك ،ہم تجھ سے تیری محبت چاہتے ہیں اور ہر اس چیز کی محبت چاہتے ہیں جو تجھ سے محبت کرتی ہے۔

و حب کل عمل یوصلنی الی قربك ،اور ہر اس عمل کی محبت چاہتے ہیں جو مجھے تیرے قرب تک پہنچا دے۔

و ان تجعلك احب الی مما سواك ،اور تجھ سے چاہتے ہیں کہ تو خود کو میرے نزدیک اپنے سوا ہر چیز سے زیادہ محبوب بنا دے،

و ان تجعل حبی ایاك قائدا الی رضوانك اور مجھے جو تجھ سے محبت ہے اسے میرے لیے تیری خوشنودی تک پہنچنے کے لیے رہنما بنا دے،

و شوقی الیك ذائدا عن عصیانك ،اور میرے شوق کو ایسا بنا دے کہ وہ مجھے تیری نافرمانی سے دور رکھے،

و امنن بانظر الیك علی اور مجھ پر اپنی نگاہ ڈال کر احسان فرما،

و انظر بعین الودو العطف الی ،اور اپنی مہربانی اور اپنے لطف کی نگاہ سے مجھ پر نگاہ کرم فرما،

و لا تصرف عنی وجهك ،اور اپنے رخ کو میری طرف سے نہ موڑ،

صحیفۂ سجادیہ ایک حیات بخش معجزہ،

صحیفۂ کاملۂ سجادیہ امام زین العابدین (ع) کا جاویدانی معجزہ اور بلند ترین دعاؤں کا سب سے جامع ذخیرہ ہے۔ یہ عظیم کتاب دوسری کتاب ہے جو صدر اسلام میں تدوین ہوئی تھی اور اہمیت کے لحاظ سے قرآن اور نہج البلاغہ کے بعد اسی کا رتبہ ہے اور اخت القرآن ، زبور آل محمد اور انجیل اہل بیت (ع) اسی کے القاب ہیں۔ استاد شہید مطہری نے اس گرانمایہ کتاب کے بارے میں اپنی کتاب فلسفۂ اخلاق میں لکھا ہے؛ صحیفۂ سجادیہ کی دعائیں بہت معتبر دعائیں ہیں سند کے لحاظ سے بھی اور مضمون کے اعتبار سے بھی، یہ امام زین العابدین علیہ السلام کی دعائیں ہیں کہ صدر اسلام سے شیعہ علماء نے ان کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہوا ہے، اور قرآن مجید کے بعد یہ

واحد مجموعہ ہے جو پہلی صدی کے اواخر اور دوسری صدی کے اوائل کی کتاب کی صورت میں ایک یادگار ہے۔ اس بنا پر قرآن مجید کے بعد سب سے پرانی شیعی کتاب ہے جو شروع میں ہی کتاب کی صورت میں منصۂ شہود پر آئی ہے اور اب بھی ہمارے پاس موجود ہے اور وہ صحیفۂ سجادیہ ہے۔

اس کتاب کی فصاحت و بلاغت ہمیشہ فصحائے عرب کی توجہ کا محور بنی رہی ہے اس طرح کہ شیعوں کے علاوہ اہل سنت نے بھی اس کی بعض دعاؤں کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ صاحب تفسیر طنطاوی صحیفۂ سجادیہ کے بارے میں لکھتا ہے؛ میں جس قدر بھی اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں ایسا لگتا ہے کہ یہ کتاب مخلوق کے کلام سے اوپر اور خالق کے کلام سے نیچے ہے سچ مچ کتنی عظیم کتاب ہے!

کتاب آزادیٔ معنوی میں شہید مطہری سے اس کتاب کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ؛ اگر ہمارے پاس حضرت علی ع اور امام زین العابدین ع کی دعاؤں کے علاوہ کوئی دلیل نہ ہوتی اور اسلام کے پاس ان چودہ صدیوں میں اور کچھ نہ ہوتا، تو یہی چیز کہ اسلام کے دو شاگردوں کے ذریعے اس دنیائے بدویت اور جہالت میں دو اس طرح کے آثار وجود میں آئے ہیں کافی تھی یہ دو کتابیں اس قدر اوج و رفعت رکھتی ہیں کہ یہ معجزے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔ مقام معظم رہبری اس گرانقیمت کتاب سے مانوس ہونے کے بارے میں فرماتے ہیں: جہاں تک ہو سکے صحیفۂ سجادیہ سے انس پیدا کرو،۔ یہ بڑی عظیم کتاب ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ زبور آل محمد ہے تو یہ واقعا ایسی ہی ہے۔ یہ معنوی ترانوں سے مملو ہے اس میں دعا ہے، درس ہے، درس اخلاق بھی ہے اور درس علم النفس بھی ہے اور اجتماعی امور کا درس بھی ہے۔ جیسا کہ اس میں آیا ہے؛ **اللھم انی اعوذ بك من ھیجان الحرص و سورة الغضب ... و الحاح الشھوة**، ان میں سے ایک ایک اخلاقی اور معنوی خصوصیت ان فاسد جڑوں کے بارے میں جو ہمارے نفس کے اندر ہیں، دعا کی زبان میں ہمیں بتاتی ہے۔ دوسری جگہ پر ارشاد ہوتا ہے: اگر کوئی یہ سوچے کہ روح اور دل کو ان کے بغیر صاف کیا جا سکتا ہے تو وہ سخت اشتباہ میں ہے۔ آدھی رات کے گریے کے ذریعے، تدبر اور فکر کے ساتھ قرآن کی تلاوت کے ذریعے، اور صحیفۂ سجادیہ کی دعاؤں کی قرائت کے ذریعے انسان کا دل صاف ہوتا ہے، یوں ہی نہیں کہ ہم کہہ دیں کہ جناب جاؤ اور اپنے دل کو صاف کرو، اب چاہے جو بھی کرو وہ تمہاری مرضی ہے!

واقعۂ حرہ:

مدینے کے لوگوں کی تاریخی بغاوت کا انتقام ہے جو انہوں نے یزید ابن معاویہ کے خلاف کی تھی اور اس کی وجہ مدینے کے لوگوں پر یزید کے عمال کی سختی تھی، یزید نے اس تحریک کو اپنے سپاہیوں کے خونی حملے کے

ذریعے کچلا کہ جب سال ۶۳ ہجری میں اس نے مسلم ابن عقبہ کی سربراہی میں اپنے لشکر کے ذریعے مدینے پر چڑھائی کی۔ مدینے والے اس کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور شہر کے چاروں طرف انہوں نے ایک خندق کھودی۔ لیکن وہ اپنے سپاہیوں سمیت مدینے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد اس نے تین دن کے لیے شہر کو اپنے سپاہیوں کے اختیار میں دے دیا کہ جس کی وجہ سے بہت سارے بے گناہوں کا خون بہایا گیا، حریم شکنی کی گئی، اور لوگوں کے ناموس پر حملے کیے گئے اس واقعے میں چھ ہزار سے زیادہ افراد مارے گئے۔ اس واقعے کے بعد کوئی بھی مسلمان اپنی بیٹی کے باکرہ ہونے کی ضمانت نہیں دے سکتا تھا۔

روضۃ النبی:

مسجد النبی کا ایک حصہ ہے جو قبلہ کی جانب جنوب مشرق کی طرف، حجرۂ طاہرہ سے منبر تک ہے جس کی لمبائی ۲۲ میٹر چوڑائی ۱۵ میٹر اور رقبہ ۳۳۰ میٹر ہے، اس کے سفید رنگ کے ستون ہیں کہ جس کے بارے میں پیغمبرص نے فرمایا ہے: ما بین بیتی (قبری) و منبری روضة من ریاض الجنة (سفینۃ البحار ۵۶۷ / ۲) میرے گھر، قبر اور منبر کے درمیان بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یہ بہت فضیلت والا مقام ہے اور مسجد النبی میں سب سے افضل جگہ ہے کہ جس میں اہم ترین آثار جیسے پیغمبر (ص) کی قبر مبارک احتمالاً حضرت زہرا (ص) کی قبر منور، منبر اور پیغمبر (ص) کا محراب واقع ہے۔ اس جگہ نماز دعا اور تلاوت کی بہت بڑی فضیلت ہے اسی لیے یہ جگہ ہمیشہ دنیا کے مسلمانوں کی توجہ کا محور رہی ہے۔

امام حسین علیہ السلام کا نام مبارک آسمانی کتابوں میں

امام رضا علیہ السلام نے جاثلیق سے فرمایا: اب جب کہ تم نے انکار نہیں کیا ہے اور اس بات کا اقرار کیا ہے تو انجیل کے دوسرے سفر کو بھی نکالو کہ جس میں پیغمبر (ص) کا نام ان کے جانشین علی علیہ السلام کا نام، ان کی بیٹی فاطمہ کا نام اور ان کے فرزندوں حسن و حسین علیہما السلام کا نام ذکر ہوا ہے۔

امام رضا (ع) نے بصرے کے ایک سفر کے دوران ایک مجلس میں کہ جس میں لوگ بھی تھے اور مختلف ادیان و مذاہب کے علماء بھی شریک تھے، منبر پر جلوہ افروز ہو کر تقریر فرمائی اور سوالوں کے جواب ارشاد فرمائے اور اس کے بعد زبور کے سفر اول کی تلاوت فرمائی۔ یہاں تک کہ آپ (ع) محمد، علی، فاطمہ اور حسنین علیہما السلام کے ناموں تک پہنچے تو آپ نے فرمایا: اے راس الجالوت! تجھے خدا کی قسم! کیا یہ داؤد کی زبور میں نہیں ہے؟

راس الجالوت نے کہا: جی ہاں! یہ سب باتیں اور نام زبور میں موجود ہیں۔

حضرت نے فرمایا: تجھے ان دس معجزوں کی قسم دیتا ہوں کہ جو خدا نے موسی ابن عمران کو عطا کیے تھے، کہ آیا توریت میں ان پانچ افراد کے عدل اور ان کی فضیلت کا ذکر نہیں ہوا ہے؟

کہا: جی ہاں! اور جو اس کا انکار کرے گا اس نے گویا خدا اور پیغمبروں کا انکار کیا ہے۔ امام نے اس سے فرمایا: توریت کا فلاں سفر لاؤ اور حضرت نے اس کو پڑھنا شروع کیا۔

راس الجالوت کو حضرت کے فصیح و بلیغ انداز میں پڑھنے پر تعجب ہوا۔ جب حضرت محمد مصطفے صلی اللہ علیہ و آلہ کے مقدس نام پر پہنچے، تو راس الجالوت نے کہا؛ جی ہاں! یہ احماد اور ان کی بیٹی، اور الیا اور شبر و شبیر ہیں کہ جس کا مطلب عربی میں ہے؛ محمد، علی فاطمہ، حسن اور حسین،

حضرت نے انجیل کا تیسرا سفر لیا اور اسے پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ آپ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کے نام پر پہنچے، اس کے بعد جاثلیق کو مخاطب قرار دیا، جو اسلامی ممالک میں عیسائیوں کا سربراہ تھا، اور فرمایا: یہ پیغمبر (ص) کہ جس کی یہاں تعریف کی گئی ہے یہ کون ہے؟ جاثلیق نے کہا: ان کی تعریف بیان کرو۔

حضرت نے فرمایا: میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہوں گا بلکہ جو خدا نے ان کی تعریف کی ہے وہی بیان کروں گا؛ وہ ناقے، عصا اور کساوالے ہیں، پیغمبر امی ہیں کہ جن کا نام مبارک توریت اور انجیل میں لکھا ہوا ہے وہ نیکی کی ہدایت کرتے اور برائی سے روکتے ہیں اور خدا کے حلال و حرام کو بیان کرتے ہیں پاک اور طیب

چیزوں کو حلال اور خبیث اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ وہ مشکل امور اور گناہوں کو دور کرتے ہیں اور عدل و انصاف اور سیدھے راستے پر چلنے کی راہ میں جو زنجیریں رکاوٹ بنتی ہیں انہیں دور کرتے ہیں۔ اے جاثلیق! تجھے عیسیٰ کی قسم جو خدا کا کلمہ اور اس کی روح تھے کیا تو نے انجیل میں پیغمبر (ص) کی ان صفات کو نہیں دیکھا ہے؟

جاثلیق نے اپنا سر جھکا لیا اور جان گیا کہ اگر انکار کرے گا تو کافر ہو جائے گا۔ تو اس نے کہا: جی ہاں! یہ صفات انجیل میں ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام نے اس پیغمبر کے نام کا ذکر کیا ہے۔

امام (ع) نے فرمایا: اب جب کہ تم نے انکار نہیں کیا ہے اور اس بات کا اقرار کیا ہے تو انجیل کے دوسرے سفر کو بھی نکالو کہ جس میں پیغمبر (ص) کا نام ان کے جانشین علی علیہ السلام کا نام، ان کی بیٹی فاطمہ کا نام اور ان کے فرزندوں حسن و حسین علیہما السلام کا نام ذکر ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ توریت اور انجیل میں نہ صرف ان پانچ پاک ہستیوں کے ناموں کا ذکر موجود ہے بلکہ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کا ذکر بھی موجود ہے معلوم ہوا کہ جب سے نبوت وجود میں آئی اسی وقت سے نیابت کے بارے میں بھی طے کر دیا گیا، یعنی اسلام اور قرآن میں پیغمبر (ص) کی نیابت و جانشینی کا مسئلہ پہلے سے ہی طے ہو چکا تھا، تا کہ امت کو سرگردانی اور اختلافات سے بچایا جا سکے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب، سوالات کے کٹہرے میں

استاد حسن الحسن مترجم: حجۃ الاسلام مولانا سید مختار حسین جعفری

کچھ لوگوں کے ذہنوں میں کچھ سوال ہیں کہ جن کا انہیں جواب چاہیے،

۱۔ یہ کہ بعض علماء ایسے اصحاب کی پیروی کرتے ہیں کہ جن کے بارے میں ثابت ہے کہ انہوں نے مذہب کی مخالفت کی ہے تو ہم کیسے ان کی پیروی کریں؟

۲۔ ایک صحابی ہے کہ جو فاسق ہے اور اس نے اہل بیت پر ظلم کیا ہے تو ہم ان کے لیے کیسے بخشش کی دعا کریں آیا یہ چیز اہل بیت (ع) کے ساتھ جو ہم محبت رکھتے ہیں اس سے منافات نہیں رکھتی؟

۳۔ صحابہ کچھ ایسے کام کرتے ہیں جن کی وجہ سے ان سے برائت لازمی ہو جاتی ہے پس ہم کیسے اس شخص کی پیروی کریں کہ جس سے برائت لازمی ہو؟

ان سوالوں کے جواب کے لیے پہلے ہم کچھ باتیں عرض کریں گے۔

۱۔ صحابہ کی تربیت میں پیغمبر (ص) کی روش:

الف؛ اس میں شک نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم (ص) نے صحابہ کی تربیت میں بھرپور کوشش کی۔ وہ صحابہ کہ جو اسلامی رسالت کے حامل تھے اور جنہوں نے خدا کی خوشنودی کی راہ میں اپنی ساری دولت بخش دی تھی اور ان سرزمینوں میں کہ جہاں ان کی ذمہ داری تھی اسلام کی نشر و اشاعت میں کوشاں رہے۔ شیعہ حضرات ان صحابہ کا مکمل احترام اور اکرام کرتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں چاہے وہ کہ جو پیغمبر (ص) کے زمانے میں تھے یا وہ جو پیغمبر (ص) کے بعد تھے، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ صحابہ کی ایک بڑی تعداد اپنے ایمان پر ثابت قدم رہی اور امیر المومنین علی (ع) کے حق خلافت کی پابند رہی اور یہ روش امیر المومنین علی (ع) کی رہنمائی کے بعد اختیار کی گئی اس لیے کہ اسلامی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ یہ روش باقی رہے۔

۲۔ صحابہ کے بارے میں ہمارا نظریہ:

شروع میں چند نکتوں پر دھیان دیں،

پہلا نکتہ؛ جب ہم کسی ایسے کلام کو دیکھتے ہیں کہ جو ایک ایسے شخص کا ہو کہ جو پیغمبر (ص) کے ساتھ رہا ہو تو یہ ایک فضیلت ہے۔ لیکن اگر دیکھیں کہ پیغمبر (ص) کی روش اور سیرت سے خارج ہے تو اس میں کوئی خوبی نہیں ہے بلکہ وہ قابل مذمت ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ صحابی ہونا ہر حال میں کسی شخص کی عصمت کا باعث نہیں ہوتا۔ اور یہ تصور کہ ہمیں صحابہ کے لیے بلند مرتبے کا قائل ہونا چاہیے اور سب کو عادل ماننا چاہیے قابل قبول نہیں ہے، اور اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور یہ تاریخ اور دین کی منطق کے برخلاف ہے۔

دوسرا نکتہ؛ ہمیں اپنی تاریخ کے تمام مراحل کی تحقیق اور جانچ پڑتال کرنا چاہیے وہ رموز کہ جنہوں نے اس تاریخ کو بنایا ہے اور خاص کر ان واقعات کی جو رسول خدا کی وفات کے بعد خلافت اور امت میں تفرقے کی صورت میں رونما ہوئے تھے۔

تیسرا نکتہ؛ صحابہ پر تنقید کرنے سے ہماری مراد انہیں گالیاں دینا یا ٹھکرانا نہیں ہے شیعہ تو مشرکوں کو بھی گالی دینا جائز نہیں سمجھتے چہ جائیکہ مسلمانوں اور رسول اکرمؐ کے صحابہ کو، اور یہ گالیوں کا جائز نہ ہونا قرآنی تعلیمات کا حصہ ہے۔

راضی ہونا اور زیبائی کو پہچاننا:

اخلاقی ضرورت کا تقاضا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے راضی اور خوش رہیں، اس شخص سے کہ جو نیک ہے اور پیغمبر (ص) کی سیرت پر عمل کرتا ہے۔ اور ایسا کر کے ہم قرآنی ہدایت کی پیروی کرتے ہیں۔ خداوند متعال قرآن مجید میں سورۂ توبہ میں فرماتا ہے: **و السابقون الاولون من المهاجرين و الانصار و الذين اتبعوهم باحسان رضى الله عنهم و رضوا عنه** اور مہاجرین اور انصار میں جو سابق الایمان ہیں اور جو نیکی کی راہ میں ان کی پیروی کرتے ہیں خدا ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی ہیں۔

۴۔ تولا اور تبرا:

ایک خاص شخص سے راضی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے خدا بھی راضی ہو چونکہ جملۂ رضی اللہ عنہ خبر دینے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ انشائیہ جملہ ہے یعنی جس سے ہم راضی ہیں اس کے لیے خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس سے راضی ہو جائے۔ مثلا ہم کہتے ہیں خدایا! فلاں اور فلاں سے راضی ہو جا اور یہ درخواست فاسق کے لیے بھی کی جا سکتی ہے کہ ہم خدا سے دعا کریں کہ وہ اس کو بخش دے اور اس سے راضی ہو جائے۔

لیکن ظالم سے نفرت اور بیزاری اسلام اور قرآن کی بنیاد پر کی جاتی ہے اور اس تبرا کا مطلب ظالم سے

نفرت ہے نہ کہ کافر سے، چونکہ کافر کے ساتھ ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے بلکہ ہمارا جھگڑا کفر، ظلم اور فسق سے ہے۔

اس کے مقابلے میں کسی شخص سے راضی ہونے کا مطلب اس کے کاموں اور اس کی روش سے راضی ہونا نہیں ہے بلکہ یہ رضایت کبھی اس شخص سے ہمدردی کی بنا پر ہوتی ہے چونکہ اس کو ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے۔

نتیجہ، ہم نے جو وضاحت کی ہے اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر ہم کسی ایسے شخص سے راضی ہوں کہ جو کسی امر میں امام کی اطاعت نہیں کرتا تو یہ چیز امام کے ساتھ ہماری دوستی سے منافات نہیں رکھتی اور ان دو چیزوں کے درمیان تلازم نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ہم خدا سے طلب کرتے ہیں کہ وہ اس کے گناہ بخش دے، جس طرح کہ قرآن میں سورۂ شعراء میں حضرت ابراہیم (ع) اپنے چچا کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں، **واغفر لابی انه کان من الضآلین** اور میرے چچا کو بخش دے اس لیے کہ وہ گمراہوں کے ساتھ ہو گیا ہے۔

اس بنا پر اگر بعض علمائے اعلام صحابہ سے رضایت کا اظہار کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس صحابی کے اندر کوئی خرابی نہیں ہے اور اس پر تنقید نہیں کی جا سکتی چہ جائیکہ وہ اس کے تمام کاموں سے راضی ہوں۔

اتحاد کی حفاظت کے لیے حضرت علیؑ کے سب سے واضح ارشادات

ترجمہ: حجۃ الاسلام مولانا سید مختار حسین جعفری

اس بارے میں تنبیہ وتحذیر کہ حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں کچھ لوگ زیادہ روی اور کچھ کوتاہی کا شکار ہوں گے ان نکات میں سے ہے کہ جن کو امام علیہ السلام اپنی زندگی میں دوگروہوں یعنی اپنے دوستوں اور اپنے دشمنوں میں دیکھ رہے تھے، اسی لیے آپ (ع) نے کوشش کی کہ اس کی روک تھام کریں اور یاد دہانی کرائیں کہ یہ دونوں راستے غلط ہیں۔ طبیعی بات ہے کہ ان کے ساتھ دشمنی کا باطل ہونا ہمارے لیے واضح ہے ،لیکن ہم مذہبی لوگ معمولا آئمہ علیھم السلام کے سلسلے میں زیادہ روی اور غلو کے بارے میں بہت کم بات کرتے ہیں۔

امیر المومنین علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۲۷ میں اپنے بارے میں کچھ باتیں بیان فرمائی ہیں کہ جن کو ذمہ داری کی تعیین کا بنیادی معیار قرار دیا جاسکتا ہے۔

و سیهلك فی صنفان محب مفرط یذهب به الحب الی غیر الحق و مبغض مفرط یذهب به البغض الی غیر الحق و خیر الناس فی حالا النمط الاوسط فالزموه والزموا السواد الاعظم فان ید الله مع الجماعة و ایاکم و الفرقه فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب الا من دعا الی هذا الشعار فاقتلوه ولو کان تحت عمامتی هذه،

عنقریب ہی دوگروہ میرے بارے میں ہلاکت کا شکار ہوں گے ایک وہ دوست کہ جو دوستی میں غلو کرے گا اور اس افراط کی وجہ سے وہ حق کے راستے سے ہٹ جائے گا اور دوسرا وہ دشمن کہ جو حد سے تجاوز کرے گا اور اس کی بے حد دشمنی اسے راہ حق سے منحرف کردے گی، میرے سلسلے میں بہترین لوگ اعتدال پسند لوگ ہیں۔ پس تم درمیانی راستے پر چلتے رہو اور سواد اعظم یعنی معاشرے کی اکثریت کے ساتھ ہو جاؤ اس لیے کہ جماعت کے سر پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے اور تفرقے سے بچو اس لیے کہ جو لوگوں سے الگ ہو جاتا ہے وہ شیطان کا شکار بن جاتا ہے جیسا کہ اگر کوئی بھیڑ بکری گلے سے الگ ہو جائے تو وہ بھیڑیے کا شکار بن جاتی ہے۔ یاد رکھو کہ جو بھی

تفرقے کی دعوت دے اسے قتل کردو چاہے وہ میرے عمامے کے نیچے ہی کیوں نہ ہو!

یہ جملے اس قدر عمیق اور پر مغز ہیں کہ جن کی شرح میں اگر کتاب لکھی جائے تب بھی کم ہے لیکن یہاں پر صرف کچھ شفاف نکات اور کلام کے لوازم کی طرف اشارہ کیا جائے گا؛

جو شخص ان کو سچ مچ دوست رکھتا ہے اسے کوشش کرنا چاہیے کہ وہ اپنی طرف سے اس بات کا لحاظ رکھے اور حدیث میں جو آپ کی طرف سے عملی دستورات بیان ہوئے ہیں ان پر عمل کرے اور دوسرے لفظوں میں پاپ سے زیادہ کیتھولیک بننے کی کوشش نہ کرے!

آپ نے معاشرے کی اکثریت کے ساتھ چلنے کو میانہ روی اختیار کرنا قرار دیا ہے یعنی گویا معاشرے کی اکثریت کے ساتھ چلنا درمیانی راستے کا حصہ ہے، اور اس چیز پر توجہ رکھنا کہ معاشرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لوازمات کیا ہوتے ہیں ایک محوری دستور ہے۔ آپ نے تاکید کی ہے کہ کوشش کریں کہ جہاں معاشرے کی اکثریت ہے آپ ان کے ساتھ رہیں اس لیے کہ خدا کا ہاتھ جماعت کے سر پر ہوتا ہے۔

ہم میں سے بہت سارے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے حق وحقیقت کے مسئلے کو بہانہ بنا کر جماعت سے بھاگنے اور متنفر رہنے کی عادت ڈال لی ہے، اور چونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اکثریت حق پر ہو لہذا ہم معاشرے کے ساتھ رہنے کو بھی ملاک نہیں مانتے۔ طبیعی چیز ہے کہ امام (ع) کو ہم سے زیادہ حق کی فکر ہے، لیکن آپ نے یہاں پر اس اہم نکتے کی جانب کہ خدا کی خاص مدد وہاں ہوتی جہاں جماعت ہو اشارہ کیا ہے تا کہ اتحاد کے مسئلے کی اہمیت کو ہمارے سامنے اجاگر کرسکیں۔

تفرقے سے باز رہنے کی تاکید کرنا اس بیش قیمت حدیث کا ایک اور اہم فقرہ ہے وہ مثال کہ جو امام نے الگ تھلگ رہنے والے اور متفرق افراد کے لیے بیان کی ہے اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عزت اور طاقت کا راز، اتحاد کی حفاظت میں مضمر ہے۔ جو لوگ متفرق ہوتے ہیں وہ کمزور ہوتے ہیں اور دشمن آسانی سے ان کو نابود کر دیتا ہے یا ان کو نشانہ بناتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی معاشرے میں اتحاد کی حفاظت کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے کہ جس کو ہم نے اسلام کے بزرگ علماء کی سیرت میں دیکھا ہے۔ اور اس چیز کو مختلف توجیہات اور بہانے کر کے ایسے ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیے!

معاشرے میں اتحاد کی حفاظت کا مسئلہ کہ جو حقیقت میں اس معاشرے کی عزت اور طاقت کا مسئلہ ہے اس قدر اہم ہے کہ آپ (ع) واضح طور پر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی تفرقے کی بات کرے اور جدائی کا دم بھرے تو آپ کو حق ہے کہ اسے قتل کر دیں! سچ مچ اگر اسلامی اتحاد کی حفاظت کے لازمی ہونے کے بارے میں صرف یہی ایک جملہ ہوتا تو بھی کافی تھا کہ جو امام (ع) کی پیروی کا دم بھرتے ہیں انہیں چاہیے کہ اپنے لیے سب

سے اہم مسئلہ مسلمانوں کے اتحاد کی حفاظت کو قرار دیں۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ آپ نے تاکید کی ہے کہ اگر کوئی تفرقہ اندازی کرے تو اگر وہ میرے عمامے کے نیچے بھی ہو تب بھی اس کے ساتھ یہی سخت سلوک ہونا چاہیے۔ حضرت کی وحدت پسندی کی سیرت اس محوری اور اہم ملاک پر عمل کرنے کا بلند ترین نمونہ ہے، اب کیسے ممکن ہے کہ کوئی اس قدر صاف اور واضح کلام سننے کے باوجود خدانخواستہ اسی امام کے دفاع کو اختلاف ڈالنے کا بہانہ بنائے؟ کون سی توجیہ کے ساتھ کلام کی اس صراحت اور اس کے ظہور کو سوالیہ نشان کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ بعض طریقے جو ہم اختیار کرتے ہیں ان کی بنیاد حماقت اور خباثت ہے، کہ جس کی وجہ سے حضرت کا دفاع کرنے کے نام پر ہم تفرقہ اندازی کرتے ہیں؟

رہبر انقلاب کی روایت، حضرت زینبؑ اور حضرت آسیہ میں فرق

ترجمہ: حجۃ الاسلام مولانا سید مختار حسین جعفری

وہ روحانی صدمے جو حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیھا کو پہنچے تھے وہ حضرت آسیہ (س) کو دیکھنے نہیں پڑے عاشور کے دن زینب کبریٰ نے اپنے اتنے سارے پیاروں کو دیکھا کہ مقتل میں گئے ہیں اور شہید ہو چکے ہیں مگر اس قدر مصائب بھی زینب کبریٰ کی نظر میں جمیل ہیں۔

حضرت زینب (س) ۱۵ رجب سال ۶۲ یا ۶۳ ھ ق میں دنیا سے چلی گئیں۔ یہ وہ بہادر خاتون ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد تحریک عاشوراء کی تشریح اور تفسیر جن کے کاندھوں پر تھی اور وہ اس تحریک کی علمبردار تھیں۔ یہاں ہم اسلام کی اس عظیم خاتون کی شخصیت کے بارے میں رہبر انقلاب کے بیان پر ایک نظر ڈالیں گے۔

تاریخ میں زینب (س) کی مثال ملنا ناممکن ہے،

حضرت زینب (س) کربلا کی جانب سفر میں بھی اپنے بھائی امام حسین (ع) کے ہمراہ تھیں اور روز عاشوراء کے حادثے کے دن وہ تمام مصائب اور آلام آپ کو بھی جھیلنے پڑے اور حسین ابن علی (ع) کی شہادت کے بعد اہل حرم کی بے سہارا جماعت کے ساتھ کہ جن میں عورتیں اور بچے رہ گئے تھے حضرت زینبؑ خدا کے ایک ولی کے عنوان سے اس طرح درخشندہ اور تابندہ ہوئیں کہ جن کی مثال نہیں لائی جاسکتی۔ کربلا کے بعد کوفے میں حضرت زینب (س) کی اسارت کے دوران جو دردناک واقعات رونما ہوئے، اور پھر شام میں جو کچھ ہوا اس سب سے لے کر آج تک کہ جب اسلامی تحریک کا ایک نیا آغاز ہے جو اسلامی تفکر کو آگے لے جانے کے لیے اور اسلامی سماج کو ترقی کی راہوں سے آشنا کرنے کے لیے ہے پوری تاریخ میں ان کی مثال نہیں پیدا کی جاسکتی۔ اسی عظیم جہاد کی وجہ سے زینب کبریٰ نے خدا کی بارگاہ میں ایک ایسا مقام حاصل کیا ہے کہ جس کی تعریف ہمارے لیے ناممکن ہے۔

حضرت زینب (س) اور حضرت آسیہ (س) میں فرق،

آپ ملاحظہ کیجیے: قرآن مجید میں ایمان کے ایک کامل نمونے کے طور پر خدا نے دو عورتوں کی مثال دی

ہے ؛ اور کفر کے نمونے کے طور پر بھی دو عورتوں کی مثال دی ہے ۔ ضرب اللہ مثلا للذین کفروا امرائت نوح و امرائت لوط کانتا تحت عبدین من عبادنا ؛ اور یہ دو مثالیں ان عورتوں سے متعلق ہیں کہ جو کفر کا نمونہ ہیں، یعنی نمونے کے طور پر مردوں کی مثال نہیں دی ہے بلکہ عورتوں کی مثال دی ہے کفر کے باب میں بھی اور ایمان کے باب میں بھی ۔ و ضرب اللہ مثلا للذین آمنوا امرات فرعون، ایمان کے ایک کامل نمونے کے طور پر ایک فرعون کی بیوی کی مثال دی ہے اور ایک حضرت مریم کبریٰ، مریم بنت عمران کی ۔

حضرت زینب کبریٰ (س) اور فرعون کی بیوی کے درمیان ایک مختصر سے موازنے سے زینب کبریٰ (س) کے مقام کی عظمت کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں فرعون کی بیوی کو ایمان کا نمونہ بتایا گیا ہے اور وہ بھی دنیا کے آخر تک پوری دنیا کے مردوں اور عورتوں کے لیے ۔ اب فرعون کی بیوی کا مقایسہ کریں کہ جو موسیٰ پر ایمان لائی تھی اور اس ہدایت کی دلدادہ تھی کہ جو موسیٰ پیش کر رہے تھے جب اس کو فرعونی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا اور تاریخ اور روایات کی روشنی میں وہ انہی اذیتوں کی وجہ سے دنیا سے چلی گئیں، جسمانی اذیت کے دوران ان کی فریاد بلند ہوئی ؛ اذ قالت رب ابن لی عندك بیتا فی الجنه و نجنی من فرعون و عمله، انہوں نے خداوند متعال سے درخواست کی کہ پروردگارا جنت میں میرے لیے گھر بنا، حقیقت میں وہ موت طلب کر رہی تھیں ؛ وہ چاہتی تھیں کہ دنیا سے چلی جائیں، و نجنی من فرعون و عمله مجھے فرعون اور فرعون کے گمراہ کن عمل سے نجات عطا کر ۔ حالانکہ فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کی اذیت و تکلیف بدنی اور ان کا دردورنج جسمانی تھا، انہوں نے حضرت زینبؑ کی طرح، کچھ بھائی دو بیٹے اور بڑی تعداد میں رشتے دار اور بھتیجے نہیں کھوئے تھے اور ان کی آنکھوں کے سامنے وہ مقتل میں نہیں گئے تھے ۔

یہ روحانی اذیتیں کہ جو حضرت زینب (س) کو جھیلنا پڑیں وہ فرعون کی بیوی جناب آسیہ کو نہیں جھیلنا پڑیں ۔ عاشور کے دن زینب کبریٰ نے اپنے اتنے عزیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مقتل میں گئے ہیں اور شہید ہو گئے ہیں ۔ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کو دیکھا، عباس کو دیکھا، علی اکبر کو دیکھا، قاسم کو دیکھا، اپنے بچوں کو دیکھا، اپنے دوسرے بھائیوں کو دیکھا، شہادت کے بعد اس قدر مصیبتیں جھیلیں، دشمن کا حملہ، حرمت شکنی، بچوں اور عورتوں کی حفاظت کی ذمہ داری، آیا ان مصیبتوں کی شدت کا جسمانی مصائب سے مقایسہ کیا جا سکتا ہے؟

لیکن ان تمام مصیبتوں کے باوجود زینب (س) نے پروردگار سے عرض نہیں کی ؛ رب نجنی، نہیں کہا : پالنے والے مجھے نجات عطا کر !! عاشور کے دن زینبؑ نے عرض کی پروردگارا ! مجھ سے قبول فرما ! بھائی کے

ٹکڑے ٹکڑے بدن کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر عرض کرتی ہیں ؛ پالنے والے اس قربانی کو ہماری طرف سے قبول فرما! جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے کیسا پایا؟ فرمایا: ما رایت الا جمیلا ۔

اتنی بڑی مصیبت زینبؑ کی آنکھوں کے سامنے جمیل ہے چونکہ خدا کی طرف سے ہے، چونکہ خدا کے لیے ہے، چونکہ خدا کی راہ میں ہے اس کے کلمے کی سربلندی کے لیے ہے، دیکھیے اس مقام کو، صبر کے اس مقام کو حق و حقیقت کے لیے اس قدر دلدادگی کو، یہ کتنا الگ ہے اس مقام سے کہ جسے قرآن کریم حضرت آسیہ کے لیے نقل کرتا ہے۔ اس سے زینب کے مرتبے کی بلندی کا پتہ چلتا ہے خدا کے لیے کام ایسا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ زینب کا کام اور زینب کا نام آج نمونہ ہے اور دنیا میں ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔

دین اسلام کی بقا، راہ خدا کی بقا، بندگان خدا کی طرف سے اس راہ پر چلتے رہنے پر منحصر ہے اور اس نے توانائی حاصل کی ہے اس کارنامے سے جو حسین ابن علی (ع) نے انجام دیا تھا اور جو کام زینبؑ نے کیا تھا۔ یعنی وہ صبر عظیم، وہ پائیداری، وہ مصیبتوں اور مشکلوں کا برداشت کرنا باعث بنا کہ آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ دینی قدریں پوری دنیا میں رائج قدروں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ یہ تمام انسانی قدریں کہ جو مختلف مکاتب میں ہیں اور بشری وجدان پر منطبق ہیں یہ وہ قدریں ہیں کہ جو دین سے برخاستہ ہیں۔ ان کی دین نے تعلیم دی ہے۔ خدا کے لیے جو کام ہوتا ہے اس کی خاصیت یہی ہوتی ہے۔

زینب کبریٰ (س) کا انقلاب، انقلاب عاشوراء کی تکمیل ہے،

زینب کبریٰ (س) کا انقلاب، انقلاب عاشوراء کی تکمیل ہے، بلکہ ایک معنی میں جو انقلاب حضرت زینب (س) نے برپا کیا تھا وہ انقلاب عاشوراء کو زندہ کرنے والا اور بچانے والا ہو گیا۔ زینب (س) کے کام کی عظمت کا تاریخ کے دیگر بڑے واقعات کے ساتھ مقایسہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کا موازنہ عاشوراء کے واقعے سے کرنا چاہیے، اور انصافا یہ دونوں برابر ہیں۔

یہ عظیم انسان، اسلام اور بشریت کی یہ عظیم خاتون مصائب کے پہاڑوں کے مقابلے پر ڈٹی رہی اور اتنے بھیانک واقعات نے ان کی آواز میں لرزش تک پیدا نہیں کی، دشمنوں کے مقابلے پر بھی نہیں اور مصیبتوں کے پہاڑ کا سامنا کرتے وقت بھی نہیں بلکہ ہر موقعے پر وہ ایک بلند چوٹی کی مانند کھڑی رہیں۔ وہ ایک درس بن گئیں، نمونہ بن گئیں پیشوا بن گئیں، پیشرو بن گئیں، بازار کوفہ میں، قید کی حالت میں، آپ (س) نے وہ حیرت ناک خطبہ ارشاد فرمایا؛ یا اھل الکوفہ یا اھل الختل و الغدر ا تبکون الا فلا رقات العبرہ ولا ھدات الزفرہ انما مثلکم کمثل التی نقضت غزلھا من بعد قوۃ انکاثا

آخری لفظ تک مضبوط فولاد کی مانند ایسا خطبہ تھا کہ جس کا مفہوم دل کی گہرائیوں میں اترتا تھا۔

حضرت زینب (س) نے ان سختیوں کو جو دشمنوں نے تھوپی تھیں ذلیل کر دیا:

اس مشکل وقت میں زینب کبریٰ نے امیر المومنین حضرت علی (ع) کے انداز میں گفتگو کی دلوں کو ہلا دیا تاریخ کو للکارا، ان کی باتیں تاریخ میں ثبت ہو کر رہ گئیں، لوگوں کے سامنے اور اسارت کے محمل میں بیٹھ کر ،اس کے بعد کوفے میں ابن زیاد کے مقابلے پر بھی اور چند ہفتے بعد شام میں یزید کے مقابلے پر بھی، اتنی طاقت کے ساتھ بات کی کہ دشمن کو بھی رسوا کیا اور ان مصیبتوں کو بھی جو دشمن نے تھوپی تھیں؛ کیا تم لوگ اپنے زعم ناقص میں پیغمبر (ص) کے اہلبیت (ع) کو مغلوب کر سکتے ہو، پسپا اور ذلیل کر سکتے ہو؟ **للہ العزۃ و لرسولہ و للمومنین** ، پیکر عزت ہیں زینب کبریٰ ،جس طرح حسین ابن علیؑ کربلا میں عاشوراء کے دن عزت کا پیکر تھے واقعات پر ان کی نگاہ اور دوسروں کی نگاہ میں فرق ہے۔ اتنے مصائب کے بعد جب دشمن نے آپ (س) کو رسوا کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا؛ **ما رایت الا جمیلا** ؛ جو کچھ ہم نے دیکھا وہ جمیل اور زیبا تھا، شہادت تھی، داغ تھا لیکن سب راہ خدا میں تھا، اسلام کی حفاظت کے لیے تھا تاریخ میں ایک ایسا نمونہ پیش کرنا تھا تا کہ امت اسلام یہ سمجھ جائے کہ ان کو کیا کرنا چاہیے، کیسے حرکت کرنا چاہیے، کیسے مقابلہ کرنا چاہیے۔

حضرت زینب (س) کی عزت اسلام کی عزت ہے:

یہ عظیم کام زینبی انقلاب ہے یہ ولی خدا کی عزت ہے۔ زینب کبریٰ اولیاء اللہ میں سے ہیں؛ ان کی عزت اسلام کی عزت ہے آپ نے اسلام کو عزت دی، قرآن کو عزت دی ہمارے اندر اتنی بلند پروازی نہیں ہے، اتنی ہمت نہیں ہے کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ یہ بانو ہمارے لیے نمونہ عمل ہیں ہم اس سے بہت چھوٹے ہیں، لیکن بہر حال ہماری حرکت زینبی حرکت کی سمت میں ہونا چاہیے؛ ہماری ہمت اسلام کی عزت اسلامی امت کی عزت اور انسان کی عزت ہونا چاہیے؛ وہی کہ جس کو خداوند متعال نے اپنے احکام اور شریعتوں کے ذریعے پیغمبروں پر فرض کیا ہے۔

تبرا کرنے کا مطلب لعنت بھیجنا نہیں ہے،

استاد: حسین الحسن ترجمہ: حجۃ الاسلام مولانا سید مختار حسین جعفری

اس مضمون میں ہم ایسی بات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ جس کی ابتدا دوران اسلام کے اواسط میں ہوئی تھی اور وہ ہے لعنت بھیجنے کا سلسلہ، ایک گروہ دوسرے گروہ پر لعنت بھیجتا تھا یا ان کے مقدسات پر لعنت بھیجتا تھا اور اس کے لیے شرعی جواز فراہم کرتا تھا اور بے حرمتی کا باعث بنتا تھا، لہذا پہلے یہ طے کرنا چاہیے کہ لعنت کیا ہے، اس کے خطرات اور نقصانات کیا ہیں، اور آیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک طرح کی لعنت حرام ہے جب کہ ایک طرح لعنت حلال اور شرعا جائز ہے۔

لعنت کے معنی کیا ہیں؟

لعن کا لغوی معنی، نکالنا اور رد کرنا ہے اور جب اس کو اللہ کی طرف نسبت ہو تو اس کا مطلب ہے ملعون کو رحمت الٰہی سے خارج کرنا۔

لعنت بھیجنے کے خطرات،

ایک دوسرے پر لعنت بھیجنا لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت کا باعث بنتا ہے اور ان کے تعلقات کو ختم کر دیتا ہے اور کبھی تو یہ ایک ایسا فتنہ ہے کہ جس کے بعد ایک اور فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اسی لیے اسلام نے لعنت بھیجنے سے منع کیا ہے اور زبان کو قابو میں رکھنے کی تاکید کی ہے اس لیے کہ انسان جو کچھ بھی کہتا ہے وہ اس کا ذمہ دار ہے۔

مومن لعنت نہیں بھیجتا۔

اسلامی تعلیمات سے مستفاد ہوتا ہے کہ لعنت بھیجنا مومن کا شیوہ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: انی لم ابعث لعانا و انما بعثت رحمۃ مجھے لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ رحم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

مخلوقات پر لعنت بھیجنا۔

کبھی انسان پر لعنت بھیجی جاتی ہے اور کبھی دیگر مخلوقات جیسے حیوان، زمان و مکان اور ہوا وغیرہ پر لعنت بھیجی جاتی ہے۔

سبھی جانتے ہیں کہ یہ مخلوقات انسان کی حرکت کرنے کے وسائل ہیں، ان کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ جو ان کی شان کے مطابق اور خدا کی خوشنودی کا باعث ہو۔ یہ چیزیں شر و مصیبت اور دکھ کا باعث نہیں ہوتیں کہ غصے کے وقت انسان ان پر لعنت بھیجنا شروع کر دے۔ پیغمبر اکرم (ص) فرماتے ہیں: لا تلعن الریح فانها مامورة و انه من لعن شیئا لیس له باهل رجعت اللعنة علیه،

ہوا پر لعنت نہ بھیجو ہوا خدائی کارکن ہے

مومن پر لعنت بھیجنا اس کو قتل کرنے جیسا ہے

جب حیوان پر لعنت بھیجنے سے منع کیا گیا ہے تو بطریق اولیٰ انسان پر لعنت بھیجنا خدا کو پسند نہیں ہے پیغمبر (ص) فرماتے ہیں: لعن المومن کقتله، مومن پر لعنت بھیجنا اس کو قتل کرنے کی مانند ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مومن پر معنوی حملے کا خطرہ اس پر مادی حملے سے کم نہ ہو۔ اور اگر مومن فاسق ہو جائے اور معصیت میں مبتلا ہو تو بھی اس کی حرمت ساقط نہیں ہوتی اور اس پر لعنت بھیجنا جائز نہیں ہے۔

جائز لعنت:

بعض روایات کو سند قرار دیتے ہوئے فقہاء نے غیر مسلمان پر لعنت کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن یہاں کچھ باتوں کا ذکر کرنا مناسب ہے۔

ہر کافر لعنت کا مستحق نہیں ہے:

ایسی کوئی دلیل نہیں ہے کہ جو بھی مومن نہ ہو وہ لعنت کا مستحق ہوگا، لعین وہ ہوتا ہے کہ جو خدا کی رحمت سے دور ہو، ممکن ہے کہ کوئی کافر یا غیر مومن جہالت یا غفلت کی بنا پر معذور ہو، جب کہ خدا کی رحمت صرف مقصرین اور معاندین سے دور ہوتی ہے۔

خداوند متعال قرآن مجید میں سورہ ء مائدہ آیت نمبر ۷۸ میں فرماتا ہے:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کافر ہو گئے تھے داؤد اور عیسیٰ کی زبان میں ان پر لعنت بھیجی گئی، چونکہ وہ ہمیشہ خدا کے حکم کی نافرمانی کرتے تھے۔

بعض فقہاء غیر بالغ پر لعنت بھیجنے کو جائز نہیں مانتے جیسے بچوں، دیوانوں اور حیوانوں پر چونکہ خدا غیر مستحق کو اپنی رحمت سے دور نہیں کرتا۔

ہمیشہ یاد رکھیے کہ مسلمان ایک امت ہیں اور دینی بھائی ہیں پس جائز نہیں ہے کہ ایک مسلمان اپنے بھائی کو لعنت کرے چونکہ یہ چیز ناراضگی اور دشمنی کا باعث ہوتی ہے اور ان کے درمیان اتحاد ختم ہو جاتا ہے، اگر ہم پوری انسانیت پر ایک نگاہ ڈالیں تو کسی بھی انسان کو دوسرے انسان پر لعنت نہیں بھیجنی چاہیے چنانچہ خدا کا بھی حکم ہے کہ مسلمان اور غیر مسلمان دونوں کے ساتھ نیک سلوک کریں۔

پس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہر کافر لعنت کا مستحق ہے۔

کسی شخص پر لعنت بھیجنے اور عنوان پر لعنت بھیجنے میں فرق،

ان آیات میں غور کرنے سے کہ جن میں لفظ لعن آیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ لعن عام ہے جیسے کافر پر لعنت، ظالم پر لعنت، اشخاص اور ان کے ناموں کی طرف اشارہ نہیں ہے، سورۂ احزاب میں ارشاد ہوتا ہے: **ان اللہ لعن الکافرین و اعدلھم سعیرا**،

یا سورۂ دہر میں ارشاد ہوا ہے: **الا لعنۃ اللہ علی الظالمین**

یہ لعنت، لعنت کے مضر نتائج کو بھی کم کر دیتی ہے چونکہ اس میں افراد مشخص نہیں ہیں چنانچہ یہ لعنت بڑی مشکل کا باعث نہیں بنتی۔

وہ روایات جن میں اشخاص پر بعینہ لعنت کی گئی ہے ان میں سے کچھ کی سند صحیح نہیں ہے اور وہ روایات کہ جن کی دلالت کے صحیح ہونے کو اگر ہم فرض کر لیں تو اخبار کے متن میں بعض افراد کا ذکر ہے کہ جو رحمت الٰہی سے دور کیے گئے ہیں، عمومی مصلحت کا تقاضا ہے کہ وہ لوگ جو ملعون اور رحمت الٰہی سے دور ہیں وہ مشخص کیے جائیں تا کہ عام لوگ اس سے متاثر نہ ہوں اور ان کے دینی آثار کو ان سے نہ چھینیں۔

اخباری اور انشائی لعنت میں فرق:

وہ لعنت جو قرآن اور روایات میں بعض افراد کے لیے وارد ہوئی ہے، جیسے، **لعن الراشی و المرتشی و الماشی بینھما**،، تو اس کے بارے میں غور کرنا پڑے گا کہ کبھی جو شخص کفر اور نافرمانی کی وجہ سے رحمت الٰہی سے دور ہوتا ہے اس کے بارے میں خبر دی جاتی ہے اس سے دوسروں کا ان پر لعنت کرنا جائز نہیں ہو جاتا چونکہ یہ دونوں لازم و ملزوم نہیں ہیں، اس لیے کہ کسی کے عقیدے کا فاسد ہونا اور اس کا رحمت الٰہی سے دور ہونا الگ بات ہے اور اس پر لعنت کا جائز ہونا دوسری بات۔

لعنت اور توہین:

اس نکتے کی طرف اشارہ کر دیں کہ زیادہ تر حالات میں لعنت کے معنی توہین اور برا کہنے کے ہیں اور ہم

پہلے عرض کر چکے ہیں کہ توہین ایک برا فعل ہے۔

العین فراہیدی کی لغت کی کتاب میں کہا گیا ہے کہ لعین اسے کہتے ہیں کہ جس کی توہین اور بے احترامی کی گئی ہو۔

ایک بار لعنت کرنا اس کے تکرار کا باعث ہوتا ہے۔

یہ بات بتا دیں کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ لعنت عنوان اولیٰ کے تحت حرام نہیں ہے لیکن عناوین ثانویہ کے تحت حرام ہے۔

اور یہ بات واضح ہے کہ مذہب کے بزرگوں کو لعنت کرنا کہ کچھ گروہ جن کو مقدس مانتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں، اور اگر ہم ان پر لعنت بھیجیں گے تو وہ بھی پلٹ کر جواب دیں گے، اسی لیے خداوند متعال نے مشرکین کے معبودوں پر لعنت کرنے سے منع کیا ہے، اس لیے کہ ممکن ہے کہ وہ بھی پلٹ کر خدا کی توہین کریں۔

تبرا کا مطلب صرف لعنت بھیجنا نہیں ہے:

ہر مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کے اولیا کے ساتھ محبت رکھنے کے علاوہ خدا اور رسولؐ کے دشمنوں سے نفرت کا اظہار بھی کرے، اسی لیے کچھ لوگ لعن کے شرعی ہونے کے قائل ہیں چونکہ وہ اسے مومن کے لیے ایک طرح سے دینی واجب پر عمل کرنے کا لازمہ مانتے ہیں۔

لیکن اس بات پر دھیان رکھنا چاہیے کہ تبرا لعنت میں منحصر نہیں ہے، بلکہ ان کے افکار کو رد کر کے اور ان کے شبہات کو دور کر کے اور ان کے دلائل کا جواب دے کر بھی تبرا کیا جا سکتا ہے اور کفر کے محاذ کے مقابلے میں واضح موقف اختیار کیا جا سکتا ہے۔

دس شعبان، امام زمانہ (عج) کی آخری توقیع صادر ہونے کی سالگرہ،

امام زمانہ عج کی آخری توقیع اور غیبت کبریٰ کا وعدہ

ترجمہ: حجۃ الاسلام مولانا سید مختار حسین جعفری

یقیناً تم آج سے ٹھیک چھ دن کے بعد وفات پا جاؤ گے پس خود کو تیار کرو لیکن کسی کو نیابت کی وصیت نہ کرنا کہ جو تمہاری وفات کے بعد تمہارا قائم مقام ہو۔ چونکہ غیبت کبریٰ کا آغاز ہو چکا ہے اور اب میرا ظہور صرف خداوند منان کے اذن سے ہوگا۔

انسانوں کی ہدایت کے لیے خدا کی آخری حجت یعنی امام زمانہ (عج)، اپنی حیات مبارکہ کی ابتدا سے ہی عام لوگوں کی نظروں سے دور تھے، اور اگر چہ وہ لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں اور ہمارے کردار اور ہماری رفتار پر ناظر اور گواہ ہیں لیکن وہ بدستور غیبت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خدا کے حکم اور اس کی مشیت سے آپ کی عمر مبارک لمبی ہے اس وقت تک کہ جب خدا آپ کو بڑے قیام اور پوری دنیا میں اسلامی حکومت کی تشکیل کا حکم دے گا اور آپ کے دست توانا پر پوری زمین میں عدل و انصاف، یکتا پرستی اور عبودیت کا دور دورا ہو۔

غیبت صغریٰ کے زمانے میں آپ (ع) کا شیعوں سے رابطہ آپ کی طرف سے منصوب نائبین کے ذریعے تھا۔ امام حسن عسکری ع کی شہادت کے بعد کہ جو ۸ ربیع الاول سال ۲۶۰ قمری میں ہوئی تھی، سے لے کر ۱۵ شعبان سال ۳۲۹ ھجری قمری یعنی ۶۹ سال تک آپ (ع) کی غیبت صغریٰ کا سلسلہ جاری رہا، اور اس مدت میں اگر آپ کے والد بزرگوار کی حیات کے ایام میں آپ کی غیبت کی مدت کو ملا دیں تو کل ۷۴ سال تک آپ کی غیبت کا سلسلہ رہا۔ اس مدت میں شیعوں کی چار ممتاز اور معروف شخصیتوں نے ترتیب وار آپ کی نیابت کے فرائض انجام دیے اور وہ حضرات آپ اور عام شیعوں کے درمیان واسطہ بنے رہے۔

وہ چار شخصیتیں کہ جو نواب اربعہ یا امام زمانہ (عج) کے سفیروں کے نام سے مشہور ہیں مندرجہ ذیل ہیں؛

۱۔ عثمان ابن سعید عمروی ۸ ربیع الاول سال ۲۶۰ ہجری سے تقریباً سال ۲۶۵ ھجری تک (۱)

۲۔ محمد ابن عثمان ابن سعید عمروی، تقریباً سال ۲۶۵ ہجری میں اپنے باپ کی وفات سے لے کر جمادی الثانی کے اختتام یعنی سال ۳۰۴ ہجری تک۔

۳۔حسین ابن روح نوبختی جمادی الثانی کے اختتام سال ۳۰۴ ہجری میں محمد ابن عثمان کی وفات سے شعبان سال ۳۲۶ ہجری تک۔

۴۔علی ابن محمد سمری شعبان ۳۲۶ میں حسیں ابن روح نوبختی کی وفات سے ۱۵ شعبان ۳۲۹ ہجری قمری تک،(۲)

امام زمانہ(عج) کی نمایندگی اور نیابت کے دو بڑے مقاصد تھے:

ا پہلا مقصد: غیبت کبریٰ کے لیے عام لوگوں کے ذہنوں کو آمادہ کرنا اور امام علیہ السلام کی مخفیانہ زندگی بسر کرنے کے سلسلے میں تدریجاً لوگوں کو عادی بنانا اور غیبت کے بارے میں لوگوں کو غفلت میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھنا؛ اگر امام علیہ السلام اچانک غیبت اختیار کر لیتے تو لوگ امام کے وجود کا انکار کر دیتے اور گمراہ ہو جاتے،غیبت صغریٰ کے زمانے میں امام علیہ السلام کے خاص نمایندے غیبت کبریٰ کے لیے لوگوں کے اذہان کو تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے،لہٰذا غیبت صغریٰ کے سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

دوسرا مقصد: امام زمانہ(عج) کے دوستوں اور طرفداروں کی رہبری،اور شیعوں کے اجتماعی مفادات کا تحفظ،اس طرح امام زمانہ(عج) نے معاشرے میں اپنی رہبری کو پہچنوایا اور اپنی براہ راست عدم موجودگی سے ہونے والے نقصان کی تلافی کرنے میں کامیابی حاصل کی۔(۳)

اس دور میں حضرت کے نواب خاص کی اہم ترین ذمہ داریاں:

۱۔ حضرت کے نام اور ان کے رہنے کی جگہ کو مخفی رکھنا اور ان کے بارے میں شک وتردید کا ازالہ کرنا،

۲۔ شیعوں کو تفرقے اختلاف اور فرقوں میں بٹنے سے بچانا،

۳۔ لوگوں کے فقہی،عقیدتی،اور علمی سوالوں کے جواب دینا،

۴۔ نیابت کے جھوٹے دعویداروں کے خلاف جہاد کرنا اور ان کے راز کو افشاء اور انہیں رسوا کرنا،

۵۔ امام سے متعلق اموال کو وصول کر کے انہیں تقسیم کرنا،

۶۔ دوسرے شہروں اور مختلف علاقوں میں امام کے وکیلوں اور سفیروں کو منظم کرنا،وغیرہ،(۴)

امام زمانہ(عج) کے آخری نائب خاص۔علی ابن محمد سمری۔کی مدت نیابت دوسرے تین نایبوں کے مقابلے میں کم تھی اور صرف تین سال تک چلی جبکہ پہلے نائب کی مدت نیابت تقریبا پانچ سال اور ان کے فرزند محمد ابن عثمان کی نیابت چالیس سال اور حسین ابن روح نوبختی کی نیابت کی مدت بائیس سال تھی۔

شیخ صدوق (رہ) نے حسن ابن احمد مکتب سے روایت کی ہے: جس سال ابوالحسن علی ابن محمد سمری کی

وفات ہوئی، اس سال میں بغداد میں تھا ان کی وفات سے چند روز پہلے میں ان کی خدمت میں پہنچا۔ تب انہوں نے امام زمانہ (عج) کی ایک توقیع نکالی، اور لوگوں کے سامنے اس کو پڑھا، اس توقیع مبارک کا مضمون یہ تھا؛

بسم الله الرحمن الرحيم ،يا علي ابن محمد السمري !اعظم الله اجر اخوانك فيك فانك ميت ما بينك و بين ستة ايام ،فاجمع امرك ولا توص الى احد فيقوم مقامك بعد وفاتك فقد وقعت الغيبة التامه فلا ظهور الا بعد اذن الله تعالى ذكره و ذلك بعد طول الامد و قسوة القلوب و امتلاء الارض جورا و سياتي من شيعتي من يدعي المشاهده الا فمن ادعى المشاهده قبل خروج السفياني و الصيحه فهو كذاب مفتر ولا حول ولا قوة الا بالله العلي العظيم ،

خدا کے نام سے جو بخشنے والا اور مہربان ہے، اے علی ابن محمد سمری خداوند متعال تمہارے سلسلے میں تمہارے دینی بھائیوں کو اجر عظیم عطا کرے کہ جو تجھے کھونے والے ہیں۔ یقیناً تم آج سے ٹھیک چھ دن بعد وفات پا جاؤ گے۔ پس اپنے آپ کو تیار کرو اور کسی کو وصیت کر کے اپنا نائب نہ بنانا، کہ جو تیرا قائم مقام ہو اس لیے کہ بڑی غیبت شروع ہو چکی ہے۔ اور اب خدا کے اذن سے ظہور ہو گا لیکن میرے ظہور کی مدت طولانی ہو گی اس قدر کہ دل سخت ہو جائیں گے اور زمین جور و ستم سے بھر جائے گی، اور عنقریب ہی کچھ میرے شیعہ مجھے دیکھنے کا دعویٰ کریں گے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ جو شخص بھی سفیانی کے خروج اور آسمانی چیخ سے پہلے مجھے دیکھنے کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا اور مکار ہے۔

حسین ابن احمد نے کہا؛ ہم نے اس توقیع مبارک کو لکھا اور علی ابن محمد سمری کے پاس سے اٹھ کر چلے آئے، اور چھ دن بعد ہم دوبارہ ان کی خدمت میں پہنچے دیکھا کہ وہ جانکنی کے عالم میں ہیں اس وقت ان کے ایک ساتھی نے ان سے پوچھا؛ تمہارے مرنے کے بعد تمہارا وصی کون ہے؟

انہوں نے سکون سے جواب دیا؛ **لله امر هو بالغه و قضى** یہ کام خدا کا ہے اور وہ خود اسے انجام دے گا۔

یہ جملہ کہتے ہی ان کی روح پرواز کر گئی (۵)

اس طرح علی ابن محمد سمری کی وفات کے ساتھ امام زمانہ (عج) کی غیبت صغریٰ کی مدت تمام ہوئی اور غیبت کبریٰ کا آغاز ہوا اور اس وقت سے اب تک آنحضرت نے اپنا کوئی خاص نائب مقرر نہیں کیا ہے، اور شیعوں کو عام وکلاء اور مراجع تقلید کی طرف رجوع کرنے کو کہا ہے۔ حضرت کی ایک توقیع شریف میں جو محمد ابن عثمان

عمروی کے نام ہے لکھا ہے:

و اما الحوادث الواقعه فارجعوا الی رواة حدیثنا فانهم حجتی علیکم و انا حجة الله علیهم (۵)

جو نئے واقعات پیش آئیں گے ان کے بارے میں ہماری حدیثوں کی روایت کرنے والوں کی طرف رجوع کریں اس لیے کہ وہ میری طرف سے تمہارے اوپر حجت ہیں اور میں ان پر خدا کی حجت ہوں۔

علی ابن محمد سمری کی وفات کے بارے میں بعض نے ۱۵ شعبان ۳۲۸ اور بعض نے ۱۵ شعبان ۳۲۹ لکھا ہے (۷)

حوالے:

۱۔ تاریخ الغیبۃ الصغریٰ، سید محمد صدر، ج ۱ ص ۴۰۴،

۲۔ مدینہ المعاجز، سید ھاشم بحرانی، ج ۸ ص ۸؛ بحار الانوار، ج ۱۵ ص ۱۵ و ص ۳۶۶؛ منتہی الآمال ج ۲ ص ۵۰۳؛ زندگانی چہاردہ معصوم ترجمہ اعلام الوری امین طبرسی ص ۵۷۰؛ الاحتجاج، شیخ طبرسی، ج ۲ ص ۲۸۶ و ۲۹۶؛ تاج المواليد علامہ طبرسی ص ۱۴۲،

۳۔ تاریخ الغیبۃ الصغریٰ، ص ۴۲۶،

۴۔ زندگانی نواب خاص امام زمان عج ص ۸۴۔۸۹،

۵۔ الغیبۃ ص ۳۹۴؛ کتاب الاربعین، شیخ ماحوزی ص ۲۲۹؛ منتہی الآمال، ج ۲ ص ۵۰۸؛ تاج المواليد ص ۱۴۵،

۶۔ منتہی الآمال ج ۲ ص ۵۰۹،

۷۔ الخرائج والجرائح قطب الدین راوندی ج ۳ ص ۱۱۲۸؛ الاحتجاج، ج ۲ ص ۵۰۹؛ کشف المحجہ سید ابن طاووس ص ۱۵۹؛ مدینہ المعاجز، ج ۸ ص ۸؛ بحار الانوار، ج ۱۵ ص ۳۶۶،

❀ ❀ ❀

شیعہ فقہ کی تاریخ پر ایک نظر

ترجمہ: حجۃ الاسلام مولانا سید مختار حسین جعفری

فقہ شیعہ کے دس ادوار، تاریخ کے آئینے میں:

علم فقہ دین مقدس اسلام کا ایک خاص علم ہے جس کا آغاز ظہور اسلام کے ابتدائی دور سے ہی ہو گیا تھا اور چودہ صدیوں میں اس نے اپنے کمال کے راستے کو طے کیا ہے اور اب بھی ہر دور کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوئے اپنی زندگی کو جاری وساری رکھے ہوئے ہے۔

علم فقہ اپنی پیدائش کے آغاز سے لے کر اب تک بے شمار ترقیوں سے ہم کنار ہوا ہے اور اس نے مختلف ادوار کو پیچھے چھوڑا ہے۔ کہ جن کو کل ملا کر دس ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

رسول اسلام (ص) اور آئمہ ءمعصومینؑ نے علم فقہ کی بنیاد رکھی تھی اور آپ حضرات کے سچے ماننے والوں نے بھی اپنے پیشواؤں کے راستے پر چلتے ہوئے ہمیشہ فقہ و فقاہت کی طرف دعوت دی ہے اور علوم آل محمد (ع) کے سرچشمۂ زلال کی طرف امت کی ہدایت کے علمبردار رہے ہیں۔

ادوار فقہ

تشریع یعنی فقہ کی ایجاد کا دور،

یہ دور کہ جو ۲۳ سال تک چلا، اس کا آغاز پیغمبر (ص) کی بعثت سے ہوا اور آپ (ص) کی رحلت پر یہ دور ختم ہو گیا۔

اس دور میں اسلامی فقہ اچانک نمودار نہیں ہوئی بلکہ رفتہ رفتہ نمایاں ہوئی۔ پیغمبر اکرم (ص) کو خدا کی جانب سے ایک جامع دین ملا اور آپ نے مکمل طور پر اسے امت کے حوالے کر دیا۔ جب بھی خدا کی جانب سے کوئی حکم آتا تھا آپ اسے لوگوں تک پہنچا دیتے تھے، کچھ لوگ پوری باریکی کے ساتھ اس کو لکھ لیتے تھے، خاص کر حضرت علی علیہ السلام تو جو کچھ بھی رسولؐ گرامی کی جانب سے صادر ہوتا تھا چاہے وہ آیات قرآن کی تفسیر ہو یا احادیث نبوی ہوں اسے لکھ لیتے تھے حضرت علی (ع) کی تحریروں کا مجموعہ کتاب علی (ع) کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ آئمہ ءمعصومین علیہم السلام کے پاس موجود تھا اور امام محمد باقر (ع) اور امام جعفر صادق (ع) کے زمانے میں بعض مسلمانوں نے اس کا مشاہدہ کیا تھا۔

فقہ کی تدوین اور تبیین کا دور:

اس دور کا آغاز پیغمبر (ص) کی رحلت سے ہوا اور امام زمانہ (عج) کی غیبت صغریٰ تک یعنی ۳۲۹ ہجری قمری تک چلتا رہا۔ اس دور میں آئمہ معصومینؑ اور ان کے کچھ اصحاب باوفا جیسے زرارہ بن اعین، محمد ابن مسلم، ابان ابن تغلب، ابوبصیر اور دیگر نمایاں شخصیتیں ان ذوات مقدسہ کے دستور کے مطابق اس اہم ذمہ داری کو نبھاتے تھے اور حضرات معصومین علیہم السلام کی رہنمائی میں فقہی مسائل اور احکام کو ان کے مآخذ سے دریافت کر کے لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے۔

اسی طرح امام عصر (عج) کی غیبت صغریٰ کے دور میں آپ کے خاص نائبین، عثمان ابن سعید عمروی، محمد ابن عثمان، حسین ابن روح نوبختی اور علی ابن محمد سمری، اور دیگر علماء وفقہاء جیسے علی ابن حسین بابویہ متوفی ۳۲۸ ھجری قمری جو کہ شیخ صدوق کے باپ تھے، محمد ابن یعقوب کلینی متوفی ۳۲۸ ھ ق، حسن ابن علی معروف بہ ابن ابی عقیل متوفی ۳۲۹ ھ ق اور محمد ابن قولویہ موجود تھے کہ جو سب کے سب اس دور کے علمی ستون شمار ہوتے ہیں۔

فقہ کی ابواب میں تقسیم کا دور:

یہ دور غیبت کبریٰ سے شروع ہو کر ۴۱۳ ھ ق میں مرحوم شیخ مفید علیہ الرحمہ کی وفات تک جاری رہا، اس دور کے علماء اور دانشمندوں نے کوشش کی کہ احادیث معصومین علیہا لسلام کی، ملاوٹ اور تحریف سے حفاظت کریں۔ اس زمانے میں مخالفین، اسلام کی تجلی کو دگرگوں کرنے کے لیے حدیثیں جعل کرتے تھے، لیکن چونکہ اصلی منابع بغیر کسی تبدیلی کے موجود تھے شیعہ علماء نے روایات کی تدوین اور تبویب کا کام شروع کر دیا تا کہ دشمن جعلی حدیثوں کو معصومین علیہم السلام کی حدیثوں کے درمیان نہ رکھ سکیں۔

ایک اور دلیل کہ جس نے فقہاء کو یہ کام کرنے پر مجبور کیا وہ یہ تھی کہ محققین اسلامی آسانی کے ساتھ حقائق تک پہنچ سکیں اور مضامین تک رسائی آسان ہو جائے۔

ایک اور اہم کام جو اس دور کے فقہاء نے انجام دیا وہ روایات کی سند اور متن کے اعتبار سے تہذیب اور تنقیح کا کام تھا تا کہ علم الحدیث کی بنیاد پڑ جائے تا کہ جو کچھ آئمہ معصومین (ع) نے نقل کیا ہے وہ الگ ہو جائے، اور مقبول، صحیح اور موثق روایات، ضعیف اور مردود روایات سے الگ ہو جائیں اور جو صحیح ہے وہ غلط سے جدا ہو جائے۔

کچھ علماء جیسے محمد ابن احمد ابن جنید اسکافی متوفی ۳۸۱ ھ ق اور محمد ابن محمد ابن نعمان ولادت ۳۳۶۔ وفات ۴۱۳ ھ ق جو شیخ مفید کے نام سے معروف ہیں اور سید مرتضی علم الہدیٰ، ولادت ۳۵۵۔ وفات ۴۳۶، ھ ق اس دور کے نمایاں فقہاء تھے۔

فقہی مسائل میں توسیع کا دور:

اس دور کی ابتدا شیخ طوسی (رہ) کے زمانے سے ہوتی ہے اور کتاب سرائر کے مصنف ابن ادریس ولادت ۵۴۳۔ وفات ۵۹۸ ھ ق تک اس کا سلسلہ چلتا ہے، اس زمانے میں فقہ اسلامی کو پرشکوہ انداز میں وسعت اور ترقی ملی اور فقہ میں اجتہاد کے ذریعے تفریع اور تطبیق کے نتیجے میں اس میں نئی فروع کا اضافہ ہوا ۔اس لیے کہ اس زمانے میں فقہ کی اجتہادی بنیادیں استوار ہو چکی تھیں اور ماضی کے تجربوں سے استفادہ کرتے ہوئے فقہی فروع کو اصول پر منطبق کیا جاتا تھا اور خارجی مصادیق پر کلی قواعد کا انطباق ہوتا تھا۔

اس زمانے کے فقہاء فقہی بحثوں میں اور دینی احکام کے بیان میں صرف روایات کے کلیات اور اصول کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ادلہ سے مستفاد مصادیق اور فروع کے سلسلے میں بھی اہتمام کرتے تھے، اسی بنا پر فقہ میں نئے مسائل شامل ہوئے اور ان کے دلائل کے بارے میں بحث کی گئی کہ جن کی ماضی میں مثال نہیں ملتی۔

اس مرحلے کے علماء کے طلایہ دار اور اس فقہی روش کے پرچمدار ابوجعفر شیخ محمد ابن حسن طوسی ولادت ۳۸۵ وفات ۴۶۰ ھ ق تھے کہ جو شیخ طوسی یا شیخ الطائفہ کے نام سے مشہور تھے، آپ نے کتاب النھایہ اور المبسوط کو اسی روش کے مطابق تالیف کیا۔ ان کے بعد قاضی ابن براج، محمد ابن ادریس اور محقق حلی نے ان کی روش کو جاری رکھا۔

استدلال کا دور:

یہ دور مرحوم ابن ادریس ولادت ۵۴۳ یا ۵۵۸ ۔۔ وفات ۵۹۸ ھ ق سے شروع ہوا اور کتاب شرائع الاسلام فی احکام الحلال والحرام کے مصنف مرحوم محقق حلی، ولادت ۵۷۶ ۔۔ وفات ۶۸۰ ھ ق کے زمانے تک چلتا رہا یہ کتاب استدلالی بحثوں اور فقہاء کے نظریات کے بارے میں تازہ تنقید اور تحقیق سے مملو ہے اس دور کے فقہاء فقہی مسائل اور جدید مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ شرعی مسائل اور فقہی فروعات کو مضبوط استدلال کے ساتھ پیش کریں۔ اس طرح کہ وہ مسئلے کو بیان کرتے تھے اس کے بعد اس کی دلیل اور سند کا ذکر کرتے تھے، اور اگر مسئلہ اختلافی ہوتا تھا تو مختلف اقوال اور مدارک کو بیان کرتے تھے اور دلیل کا ذکر کرنے کے ساتھ کسی ایک نظریے کو ترجیح دیتے تھے اور اگر اقوال متعارض ہوتے تھے اور کسی ایک قول کو ترجیح دینے کی دلیل نہیں ہوتی تھی تو یا تخییر کا حکم دیتے تھے یا توقف کا۔

اس روش کے پیشوا مرحوم ابن ادریس ہیں انہوں نے اقوال کو جمع کرنے اور ان کے بارے میں بحث

کرنے اور ان کا مقایسہ کرنے اور ان کے بارے میں تحقیق کرنے اور استدلال کو وسعت دینے میں کما حقہ جدوجہد اور محنت کی اور فقہی مسائل میں مذکورہ خصوصیات کی حامل بے مثال کتابیں لکھیں کہ جن میں سے ایک کتاب، السرائر ہے۔

استدلال اور تنقیح کی وسعت کا دور:

یہ دور کہ جو علامہ حلی ولادت ۶۴۸ ۔ وفات ۷۲۶ ھ ق سے شروع ہو کر علامہ وحید بہبہانی متوفی ۱۲۰۵ ھ ق کے زمانے تک چلتا رہا، وسیع پیمانے پر استدلالی بحثوں اور فقہاء کے نظریات کے بارے میں تنقیدوں اور تحلیلوں سے بھرا ہوا تھا اگرچہ اس دور میں فقہاء کے نظریات میں نقض وابرام تھا۔ لیکن صرف اسی پر اکتفاء نہیں کی گئی بلکہ فقہاء پہلے کی طرح اخبار وروایات کا بھی مطالعہ کرتے تھے کہ آیا سند اور دلالت کے لحاظ سے موضوع سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں یا اصحاب نے ان روایات پر عمل کیا ہے یا نہیں اس بنا پر شرعی احکام کے استخراج اور استنباط میں نئے طریقے وجود میں آئے اور ایسا ہوا کہ اس دور کے اواخر میں اسلامی فقہ کو بہت نمایاں پیشرفت اور ترقی ملی۔

اس تکامل اور تطور کی وجہ گذشتہ کتابوں کی جانچ پڑتال اور ان کے اصول ومبانی کی تنقیح اور مدارک کے بیان کے سلسلے میں فقہاء کی مسلسل اور لگاتار کوشش تھی۔

اس روش کے پیشوا مرحوم علامہ حلی ہیں انہوں نے فقہی بحثوں میں بے مثال کتابیں سپرد قلم وقرطاس کی ہیں جن میں کتاب، قواعد، تذکرۃ الفقہاء اور تحریر الاحکام سب کی سب وسیع استدلال اور تنقیح مباحث کے ساتھ فقہی مسائل پر مشتمل ہیں۔

ترقی اور کمال کا دور:

علامہ وحید بہبہانی ولادت ۱۱۱۷ ۔۔ وفات ۱۲۰۸ ھ ق کے زمانے سے اس دور کا آغاز ہوا اور مرحوم مرتضیٰ انصاری ولادت ۱۲۱۴ ۔۔ وفات ۱۲۸۱ ھ ق کے دور تک اس کا سلسلہ چلتا رہا ان چند برسوں میں دنیائے اسلام نے فقہ کی کمال یافتہ تحریک کا مشاہدہ کیا اس دور میں طرح طرح کے فقہی مسائل ہر میدان میں بیان ہوئے۔ چونکہ اس دور کے فقہاء تحقیق واستدلال کے اونچے مرتبے تک پہنچ چکے تھے انہوں نے فقہ شیعہ کو اپنے شکوہ کے اوج ثریا تک پہنچا دیا اس دور میں فقہ کے شکوہ مند ہونے کی دلیل یہ ہے کہ؛ اولا، اس دور کے فقہاء نے موجودہ مسائل اور فروع کو شائستہ طریقے سے تنقید وتحقیق کا محور بنایا۔

ثانیا، ہر مسئلے میں انہوں نے دلائل اجتہادی کو مدنظر رکھا اس بنا پر انہوں نے گذشتہ فقہاء کے اقوال کو مدنظر

رکھ کران کے بارے میں تنقید اور تحقیق کی۔

تمام خوبیاں جو اس سے پہلے والے ادوار میں تھیں وہ اس دور میں جمع ہو گئی تھیں اور اس مرحلے نے اسلامی فقہ کی ترقی پر گہرا اثر ڈالا۔

اس دور کے فقہاء کے صدر نشین، عظیم استاد محمد باقر بن محمد اکمل تھے جو وحید بہبہانی کے نام سے معروف تھے اور وہی اس فکری جولانی کا اصلی محور تھے۔ انہوں نے اس زمانے میں جو اخباریت رائج ہو چکی تھی اس کا بھی مقابلہ کیا اور اجتہاد کا دفاع کرتے ہوئے مسلسل جہاد کے ذریعے اخباریوں کو شکست دی۔

ان کے بعد نامور فقہاء درج ذیل ہیں؛ سید مہدی بحر العلوم، شیخ جعفر کاشف الغطا، میرزا قمی، ملا نراقی اور شیخ محمد حسن صاحب جواہر الکلام،

فقہی مباحث میں باریکی اور گہرائی تک جانے کا دور:

یہ مرحلہ شیخ انصاری ولادت، ۱۲۱۴۔ وفات ۱۲۸۱، کے زمانے سے شروع ہوتا ہے اور آخوند خراسانی، ولادت ۱۲۵۵۔ وفات ۱۳۲۹ کے زمانے تک چلتا ہے۔

اس دور نے انتہائی اہم اور گہری فقہی تحریک کا مشاہدہ کیا کہ جب استدلال میں باریک بینی کے لحاظ سے فقہ میں بہت نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اس دور کے فقہاء باریک بینی کے اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے۔

اس روش کے بانی مرحوم شیخ مرتضیٰ انصاری ہیں کہ جنہوں نے فقہی بحثوں میں نئی روح پھونکی اور دوسرے محققین کے قافلہ سالار بن گئے فقہی کتاب مکاسب ان کے طرز فکر کی زندہ گواہ ہے جو باریک بینی پر مشتمل نظریات اور قیمتی مطالب سے سرشار ہے۔

یہ فقہی تحریک اور جنبش کہ جو شیخ انصاری کی خالص فکر کا نتیجہ تھی اس نے اپنی بڑھتی ہوئی ترقی کی رفتار کو جاری رکھا، اور اس رفتار میں نوابغ عصر جیسے میرزائے شیرازی، بزرگ، میرزا محمد تقی شیرازی، شیخ الشریعہ اصفہانی اور دیگر فقہاء بھی جو فقہی مسائل اور اصول استنباط کا محور شمار ہوتے ہیں نے میدان میں قدم رکھا۔

فقہی مسائل کی تلخیص کا دور:

یہ دور آخوند خراسانی کے زمانے سے شروع ہو کر امام خمینی، ولادت، ۱۳۲۰۔۔ وفات ۱۴۰۹ھ ق کے زمانے تک چلتا ہے۔ یہ دور فقہی مسائل میں تلخیص، کلام میں اختصار اور عبارتوں کے کوتاہ ہونے کے لحاظ سے ایک نئی اور جدید روش کا دور ہے۔ کہ جس کی اپنی جگہ پر بہت بڑی اہمیت ہے۔ اس دور کے فقہاء نے فقہی کتابوں کی تلخیص کر کے ان کے اہم مطالب کو استخراج کیا اور اپنی حیرت انگیز تحقیقات سے سجا کر ان کو

معاشرے کے حوالے کیا ہے۔

اس دور کے بزرگ رجال اور اس روش کے ہراول، ملا محمد کاظم خراسانی ہیں جو کفایۃ الاصول کے خالق ہیں جنہوں نے کوشش کی ہے کہ مضبوط بنیادوں اور مختصر عبارتوں کی روش پر چلتے ہوئے فقہی مآخذ کی تحقیق میں ایک طرف استدلال میں گہرائی پیدا کی جائے اور تحقیق کو وسعت دی جائے اور دوسری طرف اس کام کو مختصر ترین عبارتوں کے قالب میں انجام دیا جائے۔ان کی نامکمل کتاب اللمعات النیر ہ فی شرح تکملہ التبصر ہ اور مکاسب پران کا حاشیہ اس دعوے کے زندہ گواہ ہیں۔

دوران تلخیص کے نامور فقہاء میں سے سید محمد کاظم یزدی جو عروۃ الوثقیٰ کے مصنف ہیں، آقا ضیاء الدین عراقی، شیخ محمد حسین اصفہانی، حاج شیخ عبدالکریم الحائری جو حوزۂ علمیہ قم کے بانی ہیں آیۃ اللہ بروجردی اور سید محسن حکیم قابل ذکر ہیں۔

فقہ کے ہمہ جانبہ عمل دخل کا دور:

اس دور کا آغاز امام خمینی رہ سے ہوا اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے گذشتہ ادوار میں اسلامی حکومت کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت سارے فقہی ابواب پر عمل کرنے کا راستہ ہموار نہیں تھا اس بنا پر فقہ کے سیاسی ابواب جیسے قضا اور شہادات اور حدود و دیات نہ صرف معاشرے سے بلکہ حوزوی دروس کے دائرے سے بھی خارج ہو چکے تھے اور قریب تھا کہ فقہی کتابوں سے بھی ان کو حذف کر دیا جاتا۔لیکن اسی دوران عظیم فقیہ اور صدی کے مجدد حضرت امام خمینی (رہ) نے میدان فقاہت میں قدم رکھا۔آپ نے فقہ کو زندہ کیا اور اس میں انقلاب برپا کیا، آپ فقہ عملی پر عقیدہ رکھتے اور فرماتے تھے؛

ہمیں اسلام کی عملی فقہ کو بروئے کار لانا چاہیے وگرنہ جب تک فقہ کتابوں میں اور علماء کے سینوں میں چھپی رہے گی تب تک جو لوگ دنیا کا خون چوستے ہیں ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

حضرت امام خمینی رہ نے اپنی ان تھک محنت کے ساتھ غیبت کبریٰ کے دور میں پہلی بار فقہ اور ولایت فقیہ کی بنیاد پر حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی، آپ کا یہ عقیدہ تھا کہ؛ ایک واقعی مجتہد کی نظر میں حکومت انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے فقہ کا مکمل فلسفہ ہے۔تمام اجتماعی، سیاسی فوجی اور ثقافتی مشکلات سے نمٹنے کے لیے حکومت فقہ کے عملی پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہم فقہ کے محکم اصول کو فرد اور معاشرے کی زندگی میں کس طرح عملی جامہ پہناتے ہیں اور مشکلات کا حل نکالتے ہیں استکبار کا سارا خوف اسی مسئلے کی بنیاد پر ہے کہ کہیں فقہ اور اجتہاد عینیت اور عمل کا روپ نہ دھار لے۔اور مسلمانوں کے اندر ٹکرانے کی

طاقت نہ پیدا ہو جائے۔

امام خمینی (رہ) اپنی خاص فقہی دید میں زمانے اور مکان کے دو عناصر پر توجہ مرکوز کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ فقہ شیعہ اسی بنیاد پر ہر دور میں انسانی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے آپ فرماتے تھے:

میں سنتی فقہ اور جواہری اجتہاد کا قائل ہوں اور اس سے روگردانی کو جائز نہیں سمجھتا۔ اجتہاد اسی روش پر صحیح ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی فقہ میں ترقی نہیں ہے۔ زمان اور مکان اجتہاد کے دو اٹل عناصر ہیں۔

موجودہ پر آشوب دنیا کا ایک اہم مسئلہ اجتہاد میں زمان و مکان کا کردار اور فیصلہ لینے کی نوعیت ہے۔

❀ ❀ ❀

ظہور کی حتمی علامتوں کے نمونہ اور سمبل ہونے کے فرضیے کی تحلیل اور اس پر تنقید

ترجمہ: حجۃ الاسلام مولانا سید مختار حسین جعفری

سفیانی ایک کردار اور نمونہ یا ایک حقیقت؟

کیا سفیانی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شخص نہیں بلکہ شیعوں کے خلاف ایک نظریہ یا گروہ ہے؟ یا اس کے باوجود کہ عالم اسلام میں سفیانی سلسلہ شیعوں کے خلاف ایک نظریہ کہلانے کے ساتھ کوئی بعید نہیں کہ اس گروہ کا رہبر ایک شخص ہو اور وہ بنی امیہ کے خاندان سے ہو۔

سلسلۂ مہدویت کے بارے میں جن چیزوں کے بارے میں بحث کی جاتی ہے ان میں ظہور کی علامتوں کی بحث سب سے زیادہ دلچسپ اور طرفدار رکھنے والی بحث ہے۔ مہدویت کے بارے میں جو روایات ہیں ان میں سے زیادہ تر کا اس موضوع سے متعلق ہونا اس بات کا گواہ ہے۔ یہ جذابیت ایک طرف اس مسئلے اور نتیجے میں اصل مہدویت کے مقبول عام ہونے کا باعث بنی ہے لیکن دوسری طرف اس کی وجہ سے خرافات کے اس میں داخل ہونے کا راستہ ہموار ہوا ہے اور روایتیں گڑھنے والے اور روایتوں میں تحریف کرنے والے دھوکے بازوں کی لالچ دوگنی ہوگئی ہے۔ اس بنا پر اس مسئلے کے بارے میں مدلل تحقیقات کے فقدان کے پیش نظر مناسب ہے کہ حدیث فہمی کے قواعد وضوابط پر مبتنی تحقیقات انجام دے کر اور صحیح حدیثوں کو غلط حدیثوں سے اور مستند باتوں کو غیر مستند باتوں سے الگ کر کے مہدویت کے علوم کو خرافات سے پاک کرنے کے علاوہ اس مسئلے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے امکانات کا سدباب کیا جائے۔

مباحث مہدویت کے مقالات کے سلسلے میں بحث کی جائے گی کہ اسلامی احادیث اور روایات پر اعتماد کرتے ہوئے ظہور کی حتمی علامتوں اور ان سے جڑے ہوئے مسائل کی ایک مکمل منظم اور معقول تصویر پیش کی جائے۔ اس کوشش کا کم سے کم نتیجہ یہ ہوگا کہ محققین مہدویت کی مباحث میں مستند اور غیر مستند مطالب میں فرق پیدا کر سکیں گے اور فیصلے اور تحلیل کے وقت غیر مستند مطالب پر اعتماد کرنے سے بچیں گے۔

اب اس سوال کا جواب دیا جائے گا کہ آیا سفیانی ایک کردار ہے یا ایک حقیقت ہے؟ دوسرے لفظوں میں آیا سفیانی کو شیعوں کے مخالف نظریے یا گروہ کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے؟ یا اس کے باوجود کہ سفیانی کا

مسئلہ عالم اسلام میں شیعوں کے خلاف ایک نظریہ کہلاتا ہے تب بھی بعید نہیں ہے کہ اس گروہ کا رہبر ایک شخص ہو اور خاندان ابوسفیان سے ہو۔

سفیانی، ایک کردار یا ایک حقیقت:

سفیانی کے بارے میں بنیادی سوال ہے؛ آیا لفظ سفیانی کہ روایات اور احادیث میں جس کا ذکر ہوا ہے ایک ایسا لفظ ہے کہ جو ایک کردار اور نمونے کے بیان کے لیے ہے یا یہ ایک واقعیت ہے اور ایک واقعی انسان کی طرف اشارہ ہے؟ بغیر کسی شک کے اس سوال کے جواب کا اس مسئلے کی روایات کو سمجھنے میں بہت بڑا رول ہے اور اس جواب کے کسی بھی پہلو کے انتخاب کے ساتھ روایات سے ہماری نتیجہ گیری بہت متفاوت ہو جائے گی۔ لہذا مناسب ہے کہ شروع میں ہم اس موضوع کے بارے میں تحقیق کریں۔

مشہور نظریہ یہ ہے کہ سفیانی جو ظہور کی پہلی حتمی علامت ہے بنی امیہ کی نسل سے اور ابوسفیان اور ہند جگر خوارہ کی اولاد سے اردن کی سرحد پر شام کے علاقے وای یابس میں امام کے ظہور کے سال میں ماہ رجب میں خروج کرے گا اور چھ مہینے تک جنگ کرے گا اور نو ماہ تک شام کے پانچ علاقوں پر حکومت کرے گا۔ سفیانی کہ جو امام مہدی (عج) کے مشہور ترین دشمن کے عنوان سے مشہور ہے، عراق اور شام سے اس کی پسپائی کے بعد قدس کی آزاد سازی کی جنگ میں امام مہدی (عج) کے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک گروہ ہے جو سفیانی کے ایک کردار ہونے کے بارے میں تاکید کرتا ہے اور اس کا گمان یہ ہے کہ سفیانی ایک علامتی اصطلاح ہے جو باطل محاذ کی علامت ہے اور معصومین علیھم السلام اس لفظ کا استعمال بات کو ذہن کے قریب کرنے کے لیے کیا کرتے تھے۔

مذکورہ موضوع کے بارے میں ہم دونوں ذکر شدہ فرضیوں کی دلیل کے ہمراہ جانچ پڑتال کریں گے،

لفظ سفیانی کے کردار یا علامت ہونے کا نظریہ:

کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ لفظ سفیانی ایک علامتی اصطلاح ہے اس کے نمونہ قرار دیے جانے کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ سفیانی ایک ثقافتی اور فکری مسئلہ ہے، یہ مسئلہ کہ جس نے دنیائے اسلام کے اندر جنم لیا ہے یہ شیعوں کے مہدویت کے نظریے اور اس سے جڑی ہوئی قدروں کے خلاف ہے(۱)

مذکورہ فرضیے کی بنیاد پر سفیانی کوئی انسان نہیں ہوگا۔ اسی طرح کا نظریہ دجال کے بارے میں بھی پیش کیا گیا ہے کہ جس کی بنیاد پر دجال ایک انسان نہیں بلکہ آخری زمانے کی دنیا پر حکم فرما مادی تمدن کو بتایا گیا ہے (۲) اور سفیانی بھی دجال کی طرح ایک علامت، نمونہ اور سمبل ہے۔

سفیانی کے ایک نمونہ اور علامت ہونے کا نظریہ مختلف دلائل کی رو سے غلط اور باطل ہے:

ا۔متعدد روایات اس نظریے کے ساتھ ٹکراؤ رکھتی ہیں جیسے:

الف۔وہ روایات جن میں سفیانی کے نام کا ذکر ہے؛

ب۔وہ روایات جن میں سفیانی کا نسب نامہ لکھا ہوا ہے؛

ج۔وہ روایات جن میں سفیانی کی جسمانی خصوصیات کا ذکر ہے،

ان ساری روایات میں ایک چیز مشترک ہے کہ سفیانی ایک انسان ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے متعدد روایات میں فرمایا ہے؛

انك لو رايت السفياني لرايت اخبث الناس ...و قد بلغ من خبثه انه يدفن ام ولدله مخافة ان تدل عليه. (۳)

اگر تم سفیانی کو دیکھو تو گویا تم نے پلید ترین انسان کو دیکھا اس کی خباثت اس حد تک ہوگی کہ وہ اپنے ایک فرزند کی ماں کو زندہ دفن کردے گا اس خوف سے کہ کہیں وہ اس کا راز فاش نہ کردے۔

مذکورہ حدیث کی روشنی میں سفیانی کو ایک علامت سمجھنے کا نتیجہ مذکورہ روایات کو ترک کرنا ہوگا، اور اس لیے کہ ایسا نہ ہونے پائے ہمیں سفیانی کو ایک علامت نہیں بلکہ ایک انسان ماننا ہوگا۔

۲۔سفیانی کو ایک علامت ماننا بہت ساری روایات کے ظاہری معنی کے برخلاف ہے،

اس کی وضاحت یہ ہے کہ سفیانی کو سمبل اور علامت ماننے کے لیے احادیث کے ظاہری معنی کے خلاف ان کی توجیہ کرنا پڑے گی کہ جو درست نہیں ہے۔

الف؛ وہ ساری روایات جن میں سفیانی کے دین و مذہب کے بارے میں بتایا گیا ہے۔اور ظاہراً اس کو مسلمان قرار دیا گیا ہے، ان کے ظاہری معنی کے مطابق سفیانی ایک انسان ہے لیکن جب ہم اس کو ایک نمونہ اور علامت قرار دیں گے تو ان کے ظاہری معنی کے خلاف ان کو اس معنی پر حمل کرنا پڑے گا کہ سفیانی سے مراد دنیائے اسلام میں ایک نظریہ اور ایک ثقافت ہے جو شیعوں کے عقاید کے خلاف ہے، حالانکہ ایسا بعید ہے۔

ب۔وہ روایات کہ جن میں سفیانی کے قیام کے وقت اور اس کی جگہ کے بارے میں خبر دی گئی ہے کہ وہ ایک انسان کی صورت میں قیام کرے گا۔ان روایات کی توجیہ یہ کرنا پڑے گی کہ یہ روایات شام میں اس ثقافتی لہر اور اس کے محل پیدائش کی جانب اشارہ کررہی ہیں نہ اس چیز کی طرف کہ وہ ایک معین شخص کی صورت میں قیام کرے گا۔

ج۔وہ روایات جن میں شام میں سفیانی کی حکومت اور سفیانی کے عراق، مدینے اور مکے پر حملے کی بات

کہی گئی ہے اس فرضیے کے مطابق ان کی یہ توجیہ کرنا پڑے گی کہ یہ ان ملکوں میں شیعوں کے خلاف سفیانی ثقافت کی ترویج واشاعت سے کنایہ ہے۔

د۔ وہ روایات کہ جو سفیانی کے مارے جانے کے بارے میں ہیں ان کے بارے میں کہنا پڑے گا کہ ان سے مراد سفیانی ثقافت کا خاتمہ ہے۔

ان چار قسم کی روایات سے آیا یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سفیانی انسان نہیں بلکہ ایک کردار ہے؟

شیعوں کے مشہور عقیدے، اور ظاہر روایات کی بنا پر سفیانی ایک انسان ہے جس کا نام ہے جس کی پہچان ہے بنی امیہ کے خاندان سے اور یزید کی نسل سے ہے اس کی خاص جسمانی خصوصیات ہیں اور اس کا عقیدہ شیعوں کے خلاف ہے، شام اور اردن کی سرحد پر رجب کے مہینے میں قیام کرے گا اور مختلف ممالک منجملہ عراق اور سعودی عرب پر حملہ کرے گا پس سفیانی کو علامت اور کردار سمجھنا اسلامی احادیث کے ظاہری معنی کے خلاف ہے۔ سفیانی کو ایک کردار ماننا اس وقت ممکن ہے کہ جب جن روایات میں اس کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے ان کے ظاہری معنی کو قبول کرنا ممکن نہ ہو۔ جب کہ ان روایات میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو خلاف عقل اور غیر معمولی ہو۔ اس بنا پر ان روایات کے ظاہری معنی کو کہ جو اسے ایک شخص بتاتی ہیں قبول نہ کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے (۴)

سفیانی کے انسانی ہونے کا اثبات:

دوسرے فرضیے کو ثابت کرنے کے لیے کہ جس میں سفیانی کو ایک انسان قرار دیا گیا ہے جو کچھ پہلے فرضیے کی تنقید میں کہا گیا ہے اس سے تمسک کیا جا سکتا ہے۔ روایات کی سفیانی کے نام ونسب اور ظاہری حالت کے بارے میں تصریح کہ جن سے اس کے انسان ہونے کے علاوہ کسی چیز کو نہیں سمجھا جا سکتا، اس باب کی تمام روایات کے ظاہری معنی کے مطابق سفیانی کا انسان ہونا اور ظواہر کو قبول نہ کرنے کی دلیل کا نہ ہونا، یہ وہ دلائل ہیں کہ جو دوسرے فرضیے کو ثابت کرتے ہیں۔

سفیانی، شخصی ہے یا نوعی؟

سفیانی کے انسان ہونے کو ثابت کرنے کے بعد اس سوال کا جواب دیا جانا چاہیے کہ روایات کے مدنظر جو سفیانی ہے وہ شخصی ہے یا نوعی؟

پہلا نظریہ: سفیانی شخصی ہے،

سفیانی کو شخصی ماننے کا یہ مطلب ہے کہ لفظ سفیانی ایک معین شخص کی طرف اشارہ کرتا ہے اور تاریخ میں

صرف ایک بار اور وہ بھی آخری زمانے میں امام عصر کے ظہور کے نزدیک قیام کرے گا۔ اس نظریے کی بنیاد پر مدنظر شخصیت پر لفظ سفیانی کا اطلاق اس کے خاندان ابوسفیان کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے بھی ہوسکتا ہے، اور اس کے ابوسفیان اور بنی امیہ کی خصوصیات کا حامل ہونے کے سبب بھی ہوسکتا ہے کہ جو تاریخ کے ہر دور میں معاویہ اور یزید جیسے افراد کی تربیت کر کے اسلام کے مقابلے میں قد علم کرتے رہے ہیں۔

دوسرا نظریہ: سفیانی نوعی ہے،

مذکورہ بالا نظریے کے مقابلے میں کچھ لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ سفیانی ایک معین شخص نہیں ہے بلکہ اس لفظ کا اطلاق ان شخصیتوں پر ہوتا ہے کہ جنہوں نے حق کے مقابلے میں بغاوت کی ہے اور ان کے اندر ابوسفیان کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں (۵) اس بنیاد پر یہ احتمال پایا جاتا ہے: تاریخ کے ہر دور میں مختلف سفیانیوں نے بغاوت کی ہے یا بغاوت کریں گے کہ البتہ ان میں سے ایک وہ سفیانی ہے کہ جو ظہور کے وقت امام مہدی (عج) کے مقابلے میں قیام کرے گا۔ مذکورہ نظریے کی بنیاد پر ایسے انسانوں پر لفظ سفیانی کا اطلاق ان کے اندر ابو سفیان کی عادات اور خصوصیات کی وجہ سے ہوگا ان کا خاندان ابوسفیان کی طرف منسوب ہونا لازمی نہیں ہے، اس نظریے کو نظریۂ سفیانی نوعی، سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے سفیانی سے مربوط روایات کے مجموعے سے آسانی کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ: آخری زمانے کا سفیانی صرف ایک شخص ہے۔ اور پہلے نظریے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ سفیانی شخصی ہے نوعی نہیں ہے، اس لیے کہ جن روایات میں اس کے نام ونسب اور اس کی ظاہری خصوصیات کو بیان کیا گیا اور اس کے قیام کے وقت اور اس کی جگہ اور اس سے جڑے ہوئے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب کی سب ایک لفظ سفیانی کے ذریعے ایک سفیانی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس بنا پر آئمہء معصومین علیہم السلام میں سے کسی کے کلام میں بھی سفیانی سے متعلق واقعات کے ذیل میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ پہلا سفیانی ایسا ہوگا اور آخری سفیانی کن خصوصیات کا حامل ہوگا، بلکہ تمام روایات میں لفظ سفیانی آیا ہے۔ دوسری طرف آئمہء علیہم السلام سے جب بھی سفیانی کے بارے میں پوچھا گیا تو کسی نے بھی سفیانی کو پہلے یا آخری سفیانی سے مقید نہیں کیا جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ذہنی ارتکاز اور اصحاب آئمہ (ع) کی فہم کی بنیاد پر روایات میں جس سفیانی کا ذکر ہے وہ ایک شخص ہے اور بس اور مذہبی پیشواؤں نے بھی اسی ایک شخص کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔

سفیانی کے نوعی ہونے کی احادیث کے بارے میں تحقیق،

آئمہء معصومین علیہم السلام کی ان تمام حدیثوں میں سے جو ہم تک پہنچی ہیں تین حدیثیں ہمیں ایسی ملی ہیں

جوسفیانی کے متعدد ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ابن حماد نے اپنی سند کے ذریعے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ سے نقل کیا ہے:

خروج السفیانی بعد تسع و ثلاثین (۶)

سفیانی کا قیام ۳۹ سال بعد ہوگا،

اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ آخری زمانے میں بھی ایک سفیانی قیام کرے گا اس کو دیکھتے ہوئے یہ روایت سفیانی کے متعدد ہونے پر دلالت کرتی ہے جس سے سفیانی کے نوعی ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

۲۔کتاب التشریف بالمنن میں جو سید ابن طاؤس کی ہے فتن سلیلی سے بصورت مرسل نقل ہوا ہے کہ حضرت علی (ع) نے آخری زمانے کے فتنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا؛

اولها السفیانی ،آخرها السفیانی ، فقیل له : و ما السفیانی ؟ فقال : السفیانی صاحب هجر و السفیانی صاحب الشام ،(۷)ان فتنوں کے شروع میں بھی سفیانی ہے اور آخر میں بھی سفیانی ہے،، پوچھا گیا؛ یہ دوسفیانی کون ہیں؟ حضرت نے فرمایا: ایک ھجری ہے اور دوسرا شامی،

۳۔اسی طرح حمیری کی کتاب قرب الاسناد میں امام زین العابدین (ع) سے ایک معتبر حدیث میں نقل ہوا ہے؛ان امر القائم حتم من الله و امر السفیانی حتم من الله ولا یکون قائم الا بسفیانی ،(۸) خدا کی جانب سے امر ظہور قطعی ہے اور سفیانی کا خروج بھی خدا کی جانب سے قطعی ہے ہر قیام کرنے والے کے مقابلے میں ایک سفیانی ہوتا ہے۔

مذکورہ تین روایتوں میں سے پہلی دو روایتیں ضعیف اور نا قابل اعتماد ہیں، رہ گیا تیسری روایت کا معتبر ہو نا، تو اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا لیکن ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہ روایت ان روایات کے ساتھ جو سفیانی کو ایک شخص قرار دیتی ہیں تعارض نہیں رکھتی، اور ان دونوں روایتوں کو قبول کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ روایات کے دوسرے گروہ کی بنیاد پر حتیٰ اگر یہ فرض کریں کہ حق کے ساتھ ہر قیام کرنے والے کے مقابلے میں ایک سفیانی ہوتا ہے۔ کہ آگے چل کر ہم اس کے بارے میں تحقیق اور اس پر تنقید کریں گے۔تو ان روایات کا عموم حق کے ساتھ سب سے آخری قیام کرنے والے یعنی امام مہدی (عج) کو بھی شامل ہوگا۔اس بنا پر آنحضرت کے مقابلے پر بھی ایک سفیانی جنگ وستیز اور مخاصمت کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا۔(۹)

قائم کی صفت کے بارے میں ایک بحث،

ممکن ہے یہ گمان کیا جائے کہ امام سجاد (ع) کی روایات کے مطابق کہ جو حمیری کی قرب الاسناد میں ہے

، ہر قائم اور حق کے ساتھ قیام کرنے والے کے مقابلے میں کفر کے محاذ کی طرف سے ایک سفیانی ہوگا۔

ان امر القائم حتم من الله و امر السفیانی حتم من الله و لا یکون قائم الا بسفیانی (۱۰) ظہور خداوند عالم کی جانب سے قطعی ہے اور سفیانی کا خروج بھی خدا کی جانب سے قطعی ہے اور ہر قیام کرنے والے کے مقابلے میں ایک سفیانی ہوتا ہے۔

اس سے تاریخ کے ہر دور میں سفیانی کے نوعی ہونے اور متعدد سفیانی ہونے کے نظریے کی تقویت ہو جاتی ہے، پس اس سوال اور ابہام کا کیا جواب ہے؟

جواب یہ ہے: اگر چہ تمام آئمہ معصومین علیہم السلام امر الٰہی کے ساتھ قیام کرنے والے تھے، لیکن امام عصر کے لیے القائم کی صفت کی ترویج کا منشاء حدیثی ہے اور یہ صفت معصومین (ع) کی زبان مبارک سے ان کے بیان میں کئی بار ذکر ہو چکی ہے۔

شیخ طوسی کی کتاب الغیبۃ میں امام صادق ع سے نقل ہوا ہے:

قلت لابی عبد الله: المهدی و القائم واحد؟ فقال: نعم (۱۱)

راوی نے امام جعفر صادق (ع) سے عرض کی؛ کہ کیا مہدی اور قائم، ایک ہی ہیں؟ امام (ع) نے فرمایا؛ ہاں،

اور حتی آئمہ معصومین علیہم السلام، ان راویوں اور دوستوں کے جواب میں کہ جو پوچھتے تھے کہ آیا آپ (ع) قائم ہیں؟ صرف امام مہدی (عج) اور بارہویں امام (ع) کو قائم کہا کرتے تھے۔ امام جواد (ع) نے عبد العظیم حسنی کے جواب میں کہ جنہوں نے پوچھا تھا؛ کہ آیا آپ (ع) قائم ہیں، انکار کیا اور فرمایا؛

ان القائم منا هو المهدی (۱۲)

قائم آل محمد صرف امام مہدی ہیں۔

جب پوچھنے والے آئمہ معصومین (ع) سے پوچھتے تھے کہ کیا آپ مہدی ہیں تو انکار میں جواب ملتا تھا چنانچہ امام جعفر صادق (ع) نے ایک راوی کے جواب میں یہ فرمایا؛ میں کیسے قائم ہو سکتا ہوں جب کہ ابھی سفیانی نے خروج نہیں کیا ہے؟

اس بنا پر ہم معنی اور مرتبط روایتوں میں غور و فکر کرنے سے لفظ قائم کے بارے میں بغیر کسی قرینے کے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ، قائم، امام مہدی (عج) کی مخصوص صفت ہے اور اس کا انصراف امام عصر (عج) کی طرف ہے۔ چنانچہ یہ بات آئمہ معصومین (ع) کی احادیث سے بخوبی ثابت ہے کہ انہوں نے بار بار لفظ قائم کو امام عصر (عج) کی صفت کے طور پر یاد کیا ہے (۱۳) امام جعفر صادق (ع) اس سلسلے میں فرماتے ہیں؛

انا و آل ابی سفیان اهل بیتین تعادینا فی الله قلنا صدق الله و قالوا کذب الله قاتل ابو سفیان رسول الله و قاتل معاویه علی ابن ابی طالب و قاتل یزید ابن معاویه الحسین ابن علی و السفیانی یقاتل القائم (۱۴)

ہم اور خاندان ابوسفیان دو گھرانے ہیں جن میں جنگ خدا کی خاطر ہے، ہم نے خدا کی تصدیق کی تو انہوں نے خدا کی تکذیب کی، ابوسفیان نے پیغمبر (ص) کے ساتھ جنگ کی، معاویہ نے علی ابن ابیطالب کے ساتھ، یزید نے امام حسین (ع) کے ساتھ جنگ کی اور سفیانی بھی قائم علیہ السلام کے ساتھ جنگ کرے گا۔

آخری نکتہ؛ اس اہم سوال کے جواب میں کہ آیا سفیانی ایک کردار ہے یا حقیقت؟ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سفیانی کو شیعوں کے خلاف ایک نظریے کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ دنیائے اسلام میں شیعوں کے خلاف ایک تحریک ہے جس کا رہبر ایک شخص ہے اور وہ خاندان ابوسفیان سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں سفیانی شخصی ہے نوعی نہیں ہے اور تاریخ میں اب تک ایسا شخص نہیں آیا ہے صرف آخری زمانے میں امام عصر کے ظہور کے نزدیک امام کے دشمن کے طور پر شام اور اردن کی سرحد پر وادی یابس کے علاقے میں قیام کر کے پہلے شام پر قبضہ کرے گا اور شام کے علاقے میں داخلی جنگوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد عراق اور سعودی عرب کے شیعی مراکز پر قبضہ کرنے کے لیے ان ملکوں پر حملہ کرے گا۔

حوالے:

۱۔ تاریخ مابعد الظہور، ص ۱۳۷،
۲۔ گذشتہ، ص ۱۷۵،
۳۔ کمال الدین، ج ۲ ص ۵۵۷،
۴۔ تاریخ مابعد الظہور، ص ۱۷۳،
۵۔ حکومت جہانی مہدی، ناصر مکارم شیرازی، ص ۱۸۱،
۶۔ الفتن، ابن حماد، ص ۲۲۶،
۷۔ الملاحم والفتن، ابن طاووس، ص ۱۷۲،
۸۔ قرب الاسناد، عبداللہ بن جعفر الحمیری، ص ۳۷۴،
۹۔ حکومت جہانیٔ مہدی، ناصر مکارم شیرازی، ص ۱۸۴،
۱۰۔ قرب الاسناد، حمیری، ص ۳۷۴،
۱۱۔ الغیبہ، شیخ طوسی، ص ۴۷۱،
۱۲۔ کمال الدین، شیخ صدوق، ج ۲ ص ۳۷۷،
۱۳۔ دیکھیے؛ مجلہ حدیث پژوھی، شمارہ ۱۱۔ مقالہ؛ واکاوی مفہوم و مصداق لفظ قائم در احادیث اھل بیت،
۱۴۔ معانی الاخبار، شیخ صدوق ص ۳۴۶، بحار الانوار، مجلسی، ج ۵۲ ص ۱۹۰،